الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

پانے کے لئے ہمیشہ کچھ کھونا پڑتا ہے
لوگ کھونے کے لئے تیار نہیں ہوتے
اسی لئے اکثر لوگ پانے والے نہیں بنتے

نومبر ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۸

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت
اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراطِ مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارفِ اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

کتاب	قیمت
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	2/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	1,2/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروانِ اسلام	
رازِ حیات	

Title	Price
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۸۵ شمارہ ۱۰۸

فہرست

کامیاب انسان

لی آئی کوکا (Lee Iacocca) کی پیدائش ۱۹۲۴ میں ہوئی۔ ان کے والدین بہت غریب تھے اور وہ تلاش معاش میں اٹلی چھوڑ کر امریکہ چلے گئے۔ آئی کوکا نے محنت سے تعلیم حاصل کی اور انجنیرنگ میں ماسٹر کی ڈگری لی۔ تعلیم کے بعد مسٹر آئی کوکا کو فورڈ موٹر کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ وہ ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ فورڈ کمپنی کے پریزیڈنٹ ہو گئے۔ اس کے بعد ہنری فورڈ دوم سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ ۱۹۷۸ میں انھیں فورڈ کمپنی چھوڑ دینا پڑا۔

آئی کوکا کو ایک اور کمپنی کی صدارت مل گئی جس کا نام کرسلر کارپوریشن (Chrysler Corporation) ہے۔ یہ کمپنی اس وقت بالکل دیوالیہ ہو گئی تھی۔ آئی کوکا نے تین سال کی غیر معمولی محنت سے اس کو کامیابی کے ساتھ چلوایا۔ حتیٰ کہ اب وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں:

I am the company

آئی کوکا نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام ہے *(Iacocca: An Autobiography)*

اس خود نوشت سوانح عمری میں بہت سے قیمتی تجربات ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک تجربہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> The key to success is not information. It's people. And the kind of people I look for to fill top management spots are the eager beavers. These are the guys who try to do more than they're expected to . . .

کامیابی کی کنجی معلومات اور ڈگریاں نہیں ہیں۔ یہ دراصل افراد ہیں۔ اور میں اپنی کمپنی کے بڑے عہدوں کے لیے جس قسم کے افراد کی تلاش میں رہتا ہوں وہ عمل کے شائق لوگ ہیں۔ یہ وہ آدمی ہیں جو اس سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں جتنی ان سے کرنے کی امید کی گئی ہو۔

(ٹائمس آف انڈیا ۲۲ ستمبر ۱۹۸۵)

امید سے زیادہ کام کرنا سنجیدہ اور باعمل آدمی کی قطعی پہچان ہے۔ جو لوگ امید سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کریں وہی وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی میں امید سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

انداز کلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بولنے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ واضح انداز میں بولتے تھے اور الفاظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا فرماتے تھے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعد کے زمانہ کے لوگوں سے فرمایا:

ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسرد کسردکم ھذا۔ ولکن یتکلم بکلام بیّن فصل یحفظہ من جلس الیہ (زاد المعاد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی طرح تیز تیز نہیں بولتے تھے۔ بلکہ آپ کے کلام میں فصل ہوتا تھا، آپ کے پاس بیٹھا ہوا آدمی اس کو یاد کر لیتا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یسرد الحدیث کسردکم۔ کان یحدث حدیثاً لو عدّہ العادّ لأحصاہ (متفق علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح تیز تیز باتیں نہیں کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو۔ آپ اس طرح بات کرتے تھے کہ اگر گننے والا گنے تو اس کو گن لے۔

مومن کا کلام ایک ایسے شخص کا کلام ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ مومن کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا ہر لفظ فرشتے لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے ہر قول کے لیے خدا کے یہاں جواب دہ ہونے والا ہے۔ مومن کا یہ یقین اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا اور فرشتوں کے سامنے بول رہا ہے۔ یہ تصور اس کی زبان پر لگام لگا دیتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو الفاظ تول کر اپنے منہ سے نکالتا ہے۔ خدا کا خوف اس سے تیز کلامی کا انداز چھین لیتا ہے۔ آخرت کی جواب دہی کا احساس اس کی جوشِ تقریر کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔

جو شخص اس قسم کے شدید احساسات سے دبا ہوا ہو وہ آخری حد تک سنجیدہ انسان بن جاتا ہے اور سنجیدہ انسان کی گفتگو کا انداز وہی ہوتا ہے جس کا نقشہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت میں نظر آتا ہے۔

مشتعل نہ ہو

برٹرینڈرسل ایک انتہائی آزاد خیال آدمی تھا۔ وہ اکثر ایسی غیر روایتی باتیں کرتا تھا جس سے قدامت پسند طبقہ بگڑ جاتا۔ اپنے ایک لکچر کے دوران پیش آنے والا واقعہ وہ اس طرح نقل کرتا ہے :

A man rose in fury, remarking that I looked like a monkey; to which I replied, 'Then you will have the pleasure of hearing the voice of your ancestors'.

ایک آدمی طیش میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں ایک بندر دکھائی دیتا ہوں۔ میں نے اس کو جواب دیا : پھر تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ اپنے پرکھوں کی آواز سن رہے ہیں ۔۔۔ (آٹوبیاگرافی ، صفحہ ۵۶۵)

برٹرینڈرسل کا یہ جواب نظریۂ ارتقا کے پس منظر میں ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان بندر کی نسل سے ہے۔ تاہم یہاں ہم کو اس نظریہ کی صحت سے بحث نہیں۔ یہ واقعہ ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ یہ غیر مشتعل انداز میں جواب دینے کی ایک اچھی مثال ہے۔ جب کوئی شخص آپ کے خلاف کوئی سخت جملہ کہے یا آپ پر تیز و تند تنقید کرے تو اس وقت ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو سن کر بگڑ جائیں اور اس کی سخت بات کا سخت اور شدید انداز میں جواب دیں۔ یہ جواب دینے کا غیر سنجیدہ طریقہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اشتعال انگیز بات سن کر مشتعل نہ ہوں۔ کوئی شخص خواہ کتنی ہی سخت کلامی کرے آپ اپنے توازن کو باقی رکھیں۔ آپ کا جواب ردعمل کا جواب نہ ہو بلکہ مثبت طور پر سوچا سمجھا ہوا جواب ہو۔

جواب کا پہلا انداز صرف اشتعال میں اضافہ کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا انداز اشتعال کو ٹھنڈا کرنے والا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آگ پر پانی ڈال دیا جائے۔

مزید یہ کہ دوسرا طریق جواب قائل کو خاموش کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ مذکورہ واقعہ میں برٹرینڈرسل کا جواب جتنا موثر ثابت ہوا وہ اس وقت کبھی اتنا موثر نہ ہوتا جب کہ برٹرینڈرسل نے ردعمل والا جواب دیا ہوتا۔

جھوٹا فخر

عبدالواحد ایک ادھیڑ عمر کے چپراسی ہیں جو دہلی کے ایک اردو اخبار میں کام کرتے ہیں۔ان کی تعلیم برائے نام ہے تاہم باتیں بہت دلچسپ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ مسلمان اتنا زیادہ لڑتے جھگڑتے کیوں ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا:

مسلمان اپنے رعب میں رہتا ہے

یہ چھوٹا سا جملہ مسلمانوں کی نفسیات کی بہترین ترجمانی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی بڑائی میں گم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کی رعایت نہیں کرپاتے۔ وہ اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے کہ دنیا میں صرف ان کا وجود ہے۔ ان کے سوا کسی اور کا کوئی وجود نہیں۔

اس نفسیات کے لیے دوسرا لفظ جھوٹا فخر ہے۔ یہی مسلمانوں کی اصل بیماری ہے۔ ان کے تمام مسائل جن میں وہ آج مبتلا ہیں اسی ایک چیز سے پیدا ہوئے ہیں۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کوئی آدمی اپنی اہلیت کے بقدر اپنی قیمت پاتا ہے۔ ایسی دنیا میں جھوٹے فخر سے زیادہ قاتل کوئی چیز نہیں۔

جھوٹا فخر آدمی کو غیر حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر سے عمل کا جذبہ چھین لیتا ہے جس شخص یا قوم کے اندر جھوٹا فخر پیدا ہوجائے اس کے اندر یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ وہ دوسرے کے ہنر کا اعتراف کرے یا دوسروں کے ساتھ موافقت کرکے رہ سکے۔ ایسا آدمی "پدرم سلطان بود" اور " ہم چو من دیگرے نیست "کی نفسیات میں مبتلا رہتا ہے اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ اس سے زیادہ ہلاکت خیز نفسیات اور کوئی نہیں۔

ایسے لوگوں کے لیے موجودہ دنیا میں صرف یہ مقدر ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں سے لڑتے رہیں۔ وہ احتجاج اور شکایت کی فضا سے کبھی باہر نہ آسکیں۔ اپنی ہر ناکامی کے لیے وہ صرف دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرائیں۔ وہ انھیں بے فائدہ مشغلوں میں مبتلا رہیں یہاں تک کہ مرکر قبر میں چلے جائیں۔

Speech Technology

You just say it and it will be done. That is not a sales line from any enthusiastic service retailer. Thanks to the advancement of "speech technology", the time has already come when machines can be expected to operate on just verbal command. Among domestic appliances today, some can turn off lights while other robots can use vacuum cleaners on being told to do so. Two kinds of telephones, which are already in the market in the United States, offer to place calls upon spoken commands like "call the office". Such products are reaching beyond the consumer sector. Speech chips are being used by the military, by doctors and by industries. At Chicago's international airport, luggage these days is routed to appropriate destinations by handlers calling out the name of the place to a computer that just sends the bag to the correct container.

Speech technology includes speech synthesis—or the science of teaching computer chips how to talk—and speech recognition—the science of teaching them to listen. Synthesising a voice is an easier task. Getting robots to listen has also progressed substantially, though speech chips today are generally dependent on particular speakers. In other words, they can be used by one person only. Research is going on to create a system that would respond to anyone's voice. If all this sounds like faddish gimmickry, it would be useful to listen to the voice of *Speech Technology magazine.* It estimates the industry's current size at $ 450 million, which may grow to $ 1 billion by 1990 in the United States. Meanwhile, the Japanese too are hard at work teaching their machines how to talk and listen.

The Times of India, September 6, 1985

Voice Commands

Since the dawn of the auto age 2,000 companies have produced nearly 5000 makes of cars in the U.S. But the theory of auto operation has changed little over the last century — most cars still run on the four-stroke interval-combustion engine design. But today's cars do ride more smoothly, use less fuel, last longer, handle and require less maintenance than those of 15 to 20 years ago. The biggest advance in cars comes in a small size — a microprocessor. Hidden in on-board computers in the latest cars, they regulate car operations and warn of malfunctions. Why, cars even talk today — and may be one day they'll even argue. Synthesized commands instruct or rebuke the driver: "Please fasten your seat belts," "A door is ajar." "Your fuel is low." And you can talk to the cars too. The Ford Motor Company has developed a system by which voice commands turn on car lights, raise the antenna, start the windshield wiper, or activate other electrical systems.

Span monthly, May, 1984

کن فیکون

اس سے پہلے کسی مشین کو متحرک کرنے کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ آدمی اپنا ہاتھ اس کی سوئچ تک لے جائے۔ سوئچ کو دبا کر ہی کسی مشین کو متحرک کیا جا سکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں ایک نیا سائنسی شعبہ وجود میں آیا ہے جس کو اسپیچ ٹکنالوجی کہتے ہیں۔ یعنی بات چیت کی ٹکنالوجی۔ یہ ایک قسم کا مشینی کلام ہے۔ آپ اپنی زبان سے صرف لفظی حکم دیں اور مشین اپنا کام کرنے لگے گی۔ یہ فن اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ امریکہ میں مستقل میگزین نکل رہا ہے جس کا نام ہے اسپیچ ٹکنالوجی میگزین۔

گھریلو سامانوں میں ایسے سامان بنائے گیے ہیں کہ آپ اپنی زبان سے کہیں کہ روشنی بجھا دو اور مشینی نظام روشنی بجھا دے گا۔ آپ کو اپنے کمرے کی صفائی کرنا ہے۔ آپ مشینی انسان (روبوٹ) سے زبانی طور پر کہیں گے کہ کمرہ کی صفائی کر دو اور وہ مشینی جھاڑو کے ذریعہ کمرہ کی صفائی کرنے لگے گا۔

امریکہ کے بازار میں ایسے ٹیلی فون فروخت ہو رہے ہیں کہ آپ زبانی طور پر کہیں کہ فلاں جگہ کا نمبر ملاؤ اور وہ اپنے آپ وہاں کا نمبر ملا دے گا۔ شکاگو ایرپورٹ پر مختلف مقامات کے لگیج کی تقسیم اس طرح کی جا رہی ہے کہ آدمی زبان سے جگہ کا نام لیتا ہے اور کمپیوٹر فوراً اس کو مذکورہ جگہ کے خانہ میں پہونچا دیتا ہے۔ تاہم اس قسم کی مشینیں ابھی اتنا زیادہ قیمتی ہیں کہ عام آدمی ان کی خریداری کا تحمل نہیں کر سکتا۔ صرف حکومتیں یا بڑے بڑے تجارتی ادارے ہی ان کو خرید کر اپنے یہاں رکھ سکتے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶ ستمبر ۱۹۸۵)

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے (النحل ۴۰) قدیم زمانہ کے انسان کو یہ بات قابل فہم نظر نہیں آتی تھی کہ لفظ بولنے سے کس طرح عملی واقعات ظہور میں آئیں گے۔ مگر آج اسپیچ ٹکنالوجی نے اس کو بالکل قابل فہم بنا دیا ہے۔ یہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو ایک بڑی حقیقت کا چھوٹی سطح پر مظاہرہ کر رہی ہے۔

امامت عالم کا راز

نومبر ۱۸۴۷ کی چار تاریخ تھی۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک ڈاکٹر کے کمرہ میں اس کا ملازم داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر اور اس کے دو ساتھی اپنی کرسیوں سے گر کر فرش پر اوندھے منھ بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔ ملازم نے سمجھا کہ ان لوگوں نے شاید آج کوئی تیز قسم کی شراب پی لی ہے اس بنا پر ان کا یہ حال ہوا ہے۔ اس نے ان کے کپڑے درست کیے اور خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مگر بات دوسری تھی۔ یہ دراصل سر جیمز سمپسن (۱۸۷۰-۱۸۱۱) اور ان کے دو اسسٹنٹ تھے۔ انھوں نے انسانی جسم پر کلوروفارم کے اثرات کا تجربہ کرنے کے لیے پہلی بار اس کو سانس کے ذریعہ اپنے اندر داخل کر لیا تھا۔

سمپسن ایک غریب نانبائی کے سات لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس نے اپنے گاؤں کے اسکول میں تعلیم شروع کی۔ اس نے تعلیم میں اتنی دلچسپی دکھائی کہ اس کا باپ اور چھ بھائی اس پر راضی ہو گئے کہ خود انتہائی ضروری مصارف پر قناعت کرکے اس کو اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر بھیجیں۔ اس طرح وہ اڈنبرا یونیورسٹی پہونچا اور ڈاکٹری میں اس وقت کی سب سے اونچی ڈگری (ایم ڈی) حاصل کی۔

ڈاکٹر سمپسن کو اپنے مطالعہ کے دوران معلوم ہوا کہ کلوروفارم میں بے ہوش کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس نے اس کی تحقیق شروع کر دی۔ وہ اس نتیجے پر پہونچا کہ آپریشن کے وقت اگر مریض کو وقتی طور پر کلوروفارم کے ذریعہ بے ہوش کر دیا جائے تو اس کو چیر پھاڑ کی بھیانک تکلیف سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنی تحقیق جاری رکھی۔ یہاں تک کہ خود اپنے آپ پر تجربہ کرکے یہ ثابت کر دیا کہ کلوروفارم تو بے ضرر بے ہوشی کے لیے کامیاب طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح غریب نانبائی کا یہ لڑکا انسان کو وہ چیز دے سکا جس کو ڈاکٹر براؤن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ——— دکھی انسانوں کے لیے خدا کا ایک بہترین تحفہ:

---- one of God's best gifts to his suffering children.

جدید دنیا میں مغرب کی امامت کا راز اس کے اسی قسم کے باحوصلہ افراد ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو کھویا تاکہ وہ انسانیت کو دیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا تاکہ وہ دوسروں کو خطرہ سے بچا سکیں۔

پیغام

زندگی ایک امتحان ہے ۔ یہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے ۔ اور اسی حقیقت کو سمجھنے میں ہماری تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے ، خواہ وہ دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی ۔

آخرت کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں جو کچھ ملا ہوا ہے وہ بطور آزمائش ہے نہ کہ بطور استحقاق ۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو وہ اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ اس کو خدا کی چیز سمجھے ۔ یہ چیزیں صرف اس وقت تک آدمی کے قبضہ میں ہیں جب تک اس کی مدت امتحان پوری نہ ہو ۔ مدت پوری ہوتے ہی سب کچھ اس سے چھین لیا جائے گا. اس کے بعد آدمی کے پاس جو کچھ بچے گا وہ صرف اس کے اپنے اعمال ہوں گے نہ کہ وہ ساز و سامان جن کے درمیان آج وہ اپنے آپ کو پاتا ہے ۔

دنیا کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جس طرح ایک شخص کو آزادی حاصل ہے اسی طرح یہاں دوسرے شخص کو بھی پوری آزادی حاصل ہے ۔ اس صورت حال کی وجہ سے یہ دنیا اس چیز کا ایک میدان بن گئی ہے جس کو مقابلہ (Competition) کہا جاتا ہے ۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے ، اس لیے یہاں ہر ایک شخص اور دوسرے شخص یا ہر ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کھلا مقابلہ جاری ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر کامیابی دوسروں کے بالمقابل اپنے آپ کو کامیاب بنانے کا نام ہے ۔ یہاں وہی شخص جیتتا ہے جو زندگی کے دوڑ میں دوسروں سے بازی لے جائے ۔ یہاں اسی شخص کو ملتا ہے جو دوسروں سے آگے بڑھ کر لے لینے کا حوصلہ کر سکے ۔

جن لوگوں کے پاس غیر اللہ کے سہارے ہوں وہ آخرت کی دنیا میں اپنے آپ کو بے قیمت پائیں گے ۔ اسی طرح جو لوگ صرف تعصب اور امتیاز کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہوں وہ موجودہ دنیا میں بے جگہ ہو کر رہ جائیں گے ، وہ مقابلہ کی اس دنیا میں اپنے لیے کوئی حقیقی مقام حاصل نہیں کر سکتے ۔

بڑا کام

ولیم بلیک (William Blake) نے کہا ہے کہ عظیم کام اس وقت ہوتے ہیں جب کہ انسان اور پہاڑ ملتے ہیں۔ کوئی عظیم کام سڑک پر دھکم دھکا کرنے سے نہیں ہوتا :

Great things are done when men and mountains meet.
This is not done by jostling in the street.

ولیم بلیک کی یہ بات صد فی صد درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے کام کے لیے بڑا عمل درکار ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی کٹھن چڑھائی کے بعد آدمی چوٹی پر پہونچتا ہے۔ سڑکوں پر شور وغل کرنے یا جلسوں میں الفاظ کے دریا بہانے سے کوئی بڑا مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا۔

حقیقی معنوں میں کوئی بڑا انجام پانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ حالات کو انتہائی گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے۔ اپنے وسائل اور خارجی امکانات کی پوری رعایت کرتے ہوئے منصوبہ بندی کی جائے۔ سفر شروع کیا جائے تو اس حقیقت کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے کیا جائے کہ راستہ میں دوسرے بہت سے مسافر بھی موجود ہیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی ہر وہ قربانی دے جو اس کا مقصد اس سے تقاضا کرے۔ کہیں وہ مال کی قربانی دے اور کہیں وقت کی۔ کہیں وہ رائے کی قربانی دے اور کہیں جذبات کی۔ کہیں وہ دوسروں سے نمٹے اور کہیں وہ خود اپنا احتساب کرے۔ کہیں وہ چلے اور کہیں شدید ہیجان کے باوجود رک جائے۔

پہاڑ کی چڑھائی جیسی محنت کیے بغیر کوئی بڑا کام انجام نہیں پاتا۔ ہر بڑا کام بڑی جدوجہد چاہتا ہے۔ ایسا کام جو آدمی کے مرنے کے بعد بھی اپنے مثبت اثرات باقی رکھے۔ ایسا کام جو مستقبل کی نقشہ گری کرنے والا ہو، ایسا کام جو تاریخ کے رُخ کو موڑ دے، بے پناہ محنت چاہتا ہے۔ ایسے کام کے لیے اتھاہ دانش مندی درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا کام وہی لوگ کر پاتے ہیں جو فی الواقع پہاڑ کی چڑھائی جیسے عمل کا ثبوت دیں۔ اس کے برعکس جو لوگ سڑکوں پر شور وغل کرنے کو کام سمجھیں وہ صرف اجتماعی کثافت میں اضافہ کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کو کوئی حقیقی تحفہ دینے کی توفیق نہیں پاتے۔

جرأت مندی

احمد اور اقبال دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ احمد بی اے پاس تھا۔ جب کہ اقبال کی تعلیم صرف آٹھویں کلاس تک ہوئی تھی۔

ایک بار اقبال کو ایک سرکاری دفتر میں جانا تھا۔ وہ وہاں جانے لگا تو احمد بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ دونوں مذکورہ دفتر میں پہونچے۔ احمد نے دیکھا کہ اقبال وہاں مسلسل انگریزی بول رہا ہے۔ جب دونوں باہر نکلے تو احمد نے کہا کہ تم بالکل غلط سلط انگریزی بول رہے تھے۔ میں تو کبھی اس طرح بولنے کی ہمت نہیں کروں گا۔ اقبال کو احمد کے اس تبصرے سے کوئی شرمندگی نہیں ہوئی۔ اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا:

غلط بولو تاکہ تم صحیح بول سکو۔

اقبال نے مزید کہا کہ تم اگرچہ بی اے ہو اور میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر دیکھ لینا کہ میں انگریزی بولنے لگوں گا اور تم کبھی بھی نہ بول سکوگے۔

اس واقعہ کو اب بیس سال ہو چکے ہیں۔ اقبال کے الفاظ صد فی صد صحیح ثابت ہوئے۔ احمد آج بھی وہیں ہے جہاں وہ بیس سال پہلے تھا۔ مگر اقبال نے اس مدت میں زبردست ترقی کی۔ وہ اب بے تکلف انگریزی بولتا ہے اور بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس کی گفتگو میں زبان کی غلطی پکڑ سکیں۔

اقبال کے اس جرأت مندانہ مزاج نے اس کو بہت فائدہ پہونچایا۔ اس سے پہلے شہر میں اس کی ایک معمولی دکان تھی۔ مگر آج اسی شہر میں اس کا ایک بڑا کارخانہ قائم ہے "غلط بولو تاکہ تم صحیح بول سکو" اس کے اپنے حق میں صد فی صد درست ثابت ہوا۔

اقبال کے اس طریقہ کا تعلق صرف زبان سے نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ موجودہ دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو حوصلہ کے مالک ہوں، جو بے دھڑک آگے بڑھنے کی ہمت کر سکیں۔ جو خطرہ مول لے کر اقدام کرنے کی جرأت رکھتے ہوں۔ اس دنیا میں غلطی کرنے والا ہی صحیح کام کرتا ہے۔ جس کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں اس سے غلطی نہ ہو جائے وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اس کے لیے آگے کی منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔

اقتصادی حملہ

ہوائی (Hawaii) بحرالکاہل کا جزیرہ ہے۔ اس کے ایک ساحلی مقام کا نام پرل ہاربر ہے۔ پرل ہاربر کو امریکہ نے ایک فوجی بندرگاہ کے طور پر ترقی دی۔ یہ بحرالکاہل میں امریکہ کا سب سے زیادہ مضبوط بحری اڈہ بن گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ۷ دسمبر ۱۹۴۱ کو جاپان نے پرل ہاربر پر بمبار ہوائی جہازوں سے حملہ کیا۔ اس وقت امریکہ کے تقریباً ایک سو جنگی جہاز یہاں موجود تھے۔ جاپانی بمباری نے ان میں سے اکثر کو تباہ کر دیا۔

اس کا بدلہ امریکہ نے اس طرح لیا کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ کو اس نے دو ایٹم بم جاپان پر گرائے۔ جس کے نتیجہ میں جاپان کے دو اہم ترین صنعتی شہر بالکل تباہ ہو گئے۔ تاہم یہ دونوں شہر (ہیروشیما اور ناگاساکی) اب دوبارہ زیادہ شاندار طور پر تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ ۱۹۴۵ میں وہ جاپان کی بربادی کی علامت تھے۔ ۱۹۸۵ میں وہ جاپان کی غیر معمولی ترقی کی علامت ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ جاپان کی مکمل شکست پر ہوا تھا۔ مزید یہ کہ امریکہ نے اس کے اوپر اپنی فوجی اور سیاسی بالادستی قائم کر لی۔ مگر جاپان نے حیرت انگیز طور پر اس کا ثبوت دیا کہ وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق بدل لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے وہ ہتھیاروں پر یقین رکھتا تھا مگر جنگ کے بعد اس نے خود اپنی مرضی سے ہتھیار الگ رکھ دیئے اور خالص پُرامن انداز میں اپنی نئی تعمیر شروع کر دی۔ جاپان نے لڑائی کے میدان کو چھوڑ دیا جو اس کے لیے بند ہو گیا تھا۔ اس نے تعمیر کے میدان کو اختیار کر لیا جو اب بھی اس کے لیے کھلا ہوا تھا۔

دوسری تدبیر پہلی تدبیر سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ جاپان صنعت و تجارت میں اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ آج وہ دنیا کی دوسری سب سے بڑی اقتصادی طاقت سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ کے مقابلہ میں اس کا ٹریڈ سرپلس ۳۷ بلین ڈالر کے بقدر زیادہ ہے۔ جنگ کے فاتح امریکہ کو مفتوح جاپان نے اقتصادیات کے میدان میں شکست دے دی۔

اس صورت حال سے امریکہ کے لوگ بے حد پریشان ہیں۔ وہ جاپان کے موجودہ حملہ کو

اقتصادی پرل ہاربر (Economic Pearl Harbour) کا نام دیتے ہیں۔ امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جو اس وقت امریکہ اور جاپان میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب بن گئی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے، جاپان نمبر ایک (Japan — Number One)

اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان اور امریکہ کے درمیان تجارت میں جاپان بہت زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اور عنقریب وہ برطانیہ سے بھی آگے بڑھ جانے والا ہے۔ بیرونی اثاثہ کے اعتبار سے جاپان آج دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند قوم ہے۔ اس کا بیرونی اثاثہ ۱۹۸۴ کے آخر میں ۷۴ بلین ڈالر تھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳-۱۴ جون ۱۹۸۵)

جاپان نے اپنی فوجی شکست کو اقتصادی فتح میں کس طرح تبدیل کیا۔ جواب یہ ہے کہ اس کا راز یہ تھا کہ جاپان نے از سر نو وہاں سے اپنا سفر شروع کیا جہاں حالات نے اس کو پہونچا دیا تھا۔ اس نے اشتعال کے بجائے صبر کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے ٹکراؤ کے میدان سے ہٹ کر پُرامن میدان میں اپنی قوتوں کو استعمال کیا۔ جو امکان برباد ہو گیا تھا، وہ اس کا فریادی نہیں بنا۔ بلکہ جو امکان باقی رہ گیا تھا اس نے اپنی ساری توجہ اس پر لگا دی۔

خلاصہ یہ کہ جاپان نے دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنے آپ کو الزام دیا اور اس کے بعد فوراً اس کی نئی تاریخ بننا شروع ہو گئی جو اس وقت تک نہ رکی جب تک وہ تکمیل کی حد کو نہ پہونچ گئی۔

آپ اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ یہاں دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں۔ اور وہ سب بڑھنے اور غالب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کے مقابلہ میں آپ کا طریقہ دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ جہاں کوئی دوسرا آپ کو اپنی راہ میں حائل نظر آئے وہاں آپ اس سے لڑنا شروع کر دیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ٹکراؤ سے بچ کر اپنی مثبت تعمیر کرنے کی کوشش کریں۔

تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں صرف دوسرا طریقہ کامیاب طریقہ ہے۔ اس کے برعکس پہلا طریقہ صرف بربادی کا طریقہ ہے۔ سمندری جہاز کو اگر چلتے ہوئے راستہ میں چٹان مل جائے تو وہ اس سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ اور جو جہاز اس سے لڑ کر جانا چاہے وہ ٹوٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے جہاز کے لیے منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔

تکرار نہیں

مسٹر جوگندر سنگھ ایم اے پیدائش (۱۹۲۴) نے ۹ جولائی ۱۹۸۵ کی ملاقات میں اپنا ایک واقعہ بیان کیا۔ وہ ۱۹۵۶ میں پروفیسر ایس۔ پی۔ کنال کے طالب علم تھے۔ موصوف کا خاص مضمون یونانی فلسفہ تھا۔ وہ ۳۰ سال تک یہی مضمون پڑھاتے رہے اور دہلی یونیورسٹی سے ریڈر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

مسٹر جوگندر سنگھ نے بتایا کہ پروفیسر ایس۔ پی۔ کنال کی ملازمت کے آخری دنوں میں ایک بار وہ ان سے ملے۔ جب وہ پروفیسر موصوف کے گھر پہونچے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ یونانی فلسفہ پر ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔

مسٹر جوگندر سنگھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ انھوں نے اپنے استاد سے کہا: آپ نے تو یونانی فلسفہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر اسی مضمون کو آپ ۳۰ سال سے برابر پڑھا رہے ہیں۔ اب تو آپ کو وہ سب یاد ہو گیا ہوگا۔ پھر آپ اب بھی کیوں اسی مضمون کو پڑھ رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے جواب دیا:

Every successive reading gives me a new thought.

ہر اگلا مطالعہ مجھ کو نیا فکر دیتا ہے۔

اگر آدمی کا شعور بیدار ہو، اگر اس کے ذہن میں جاگ پیدا ہو چکی ہو تو اس کا مطالعہ صرف انھیں محدود الفاظ کا مطالعہ نہیں ہوتا جن کو اس نے کاغذ کے صفحہ پر پڑھا ہے۔ پڑھنے کے دوران اس کا اپنا ذہن مزید غیر مکتوب پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ وہ جتنا پڑھتا ہے اس سے زیادہ وہ اپنے لیے حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح اس کا مطالعہ مسلسل اس کے علم کو بڑھاتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "تکرار" کی شکایت صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس اپنی طرف سے شامل کرنے کے لیے کچھ نہ ہو۔ جن کے پاس اپنی طرف سے شامل کرنے کے لیے ہو وہ ایک ہی چیز کو بار بار پڑھ کر بھی نہیں اکتاتے۔ کیوں کہ ہر بار مطالعہ سے وہ نئی چیز حاصل کر لیتے ہیں۔

الٹی خوراک

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے سارے عالم اسلام میں کوششیں کی گئی ہیں۔ یہ کوششیں ماضی کی تمام احیائی کوششوں کی مجموعی مقدار سے بھی زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود نتیجہ بالکل صفر ہے۔ شاندار کوششوں کے بے شان انجام کی یہ ایسی مثال ہے جس کی کوئی دوسری نظیر ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس عظیم ناکامی کی وجہ اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہوگی " الٹی خوراک" یعنی مسلمانوں کو دوبارہ متحرک کرنے کے لئے ان کے اندر جو مزاج بنانا تھا، اس کے برعکس دوسرا مزاج ان کے اندر بنایا گیا۔ چنانچہ مصلحین کی تمام کوششیں اور قربانیاں اصل مقصد کے اعتبار سے رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔

موجودہ زمانہ کے مصلحین نے ملت کی اصلاح کے لئے جو طریقے اختیار کئے وہ ظاہری طور پر اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر ان سب کا خلاصہ صرف ایک تھا۔ انھوں نے ملت کے احساس فخر کو ابھارا۔

ہمارے مصلحین نے ماضی کی عظمت کو یاد دلا کر حال میں دوبارہ عظیم بننے کا پیغام دیا۔ ہمارا دین سب سے زیادہ کامل ہے، ہمارا رسول سب سے زیادہ افضل ہے، ہماری تاریخ سب سے زیادہ شاندار ہے۔ ہماری شریعت سب سے زیادہ اعلیٰ ہے، ہمارے اکابر سب سے زیادہ باکمال ہیں۔ ہماری امت تمام امتوں میں خیر الامم ہے۔ یہی وہ فکری غذا ہے جو موجودہ زمانہ کے تمام مصلحین نے ایک انداز سے یا دوسرے انداز سے دی ہے۔ اس میں غالباً کسی مصلح کا کوئی استثنار نہیں۔

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ موجودہ حالات میں صرف ایک ہی ہو سکتا تھا اور وہی ہوا۔ اور وہ ہے جھوٹا احساس فخر۔ ایک زوال یافتہ قوم کے لئے جھوٹے فخر کی غذا ہمیشہ سب سے زیادہ مرغوب غذا ہوتی ہے۔ چنانچہ قوم کی قوم ان رہنماؤں کے پیچھے دوڑ پڑی۔ مگر قوم کی موجودہ حالت میں یہ خوراک اس کے لئے الٹی خوراک ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ہمارے شاعروں اور خطیبوں کے

الفاظ سے زمین و آسمان بھر رہے ہیں، دوسری طرف قوم جہاں تھی وہیں بدستور پڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکی۔

حقیقت واقعہ تو یہ تھا کہ قوم زندگی کے دوڑ میں بچھڑ گئی تھی۔ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئی تھی۔ ایسی حالت میں اصل ضرورت یہ تھی کہ کھونے کا احساس دلا کر اس کے اندر پانے کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ اس کے برعکس مذکورہ قسم کی باتوں نے یہ کیا کہ جن چیزوں کو ہم نے واقعہ میں کھو دیا تھا ان سے وراثتی رشتہ جوڑ کر ان کو اپنے خانہ میں لکھ لیا۔ جو چیز واقعاتی اعتبار سے اپنی نہ تھی اس کو وراثتی اعتبار سے اپنی بنا لیا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو کسی نے "پدرم سلطان بود" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور حقائق کی اس دنیا میں پدرم سلطان بود سے زیادہ بری نفسیات اور کوئی نہیں۔

انسان کا اصل سرمایہ عجز ہے نہ کہ بڑائی۔ فخر اور بڑائی کی نفسیات پیدا کرنا گویا انسان کو خداوالی خوراک دینا ہے۔ خدائی غذا پر انسان کی تعمیر کرنا ہے۔ اس قسم کی الٹی خوراک صرف ایسے انسان پیدا کر سکتی تھی جو جھوٹے جنون عظمت (Paranoia) میں مبتلا ہوں۔ اور جھوٹا جنون عظمت ذلت اور بربادی کے سوا اور کہیں آدمی کو نہیں پہنچاتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل بیماری، ایک لفظ میں، جھوٹا فخر ہے۔ یہ عین وہی بیماری ہے جو بعد کے زمانہ میں یہود کے اندر پیدا ہوئی۔ اور اب وہ مسلمانوں میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکی ہے۔

فخر کی نفسیات دینی لحاظ سے بھی غلط ہے اور دنیاوی لحاظ سے بھی۔ دینی لحاظ سے اس کی غلطی یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال پر ایمان آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے اور فخر کا مزاج عین اس کا ضد ہے۔

دنیا کے لحاظ سے اس کی غلطی یہ ہے کہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو اس کے عمل کے بقدر حصہ ملتا ہے۔ مگر فخر کی نفسیات عمل اور جد و جہد کی قاتل ہے۔ ایسا آدمی کبھی عمل کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور جب قانون قدرت کے مطابق ناکام ہوتا ہے تو دوسروں کی شکایت کرتا ہے۔ وہ پانے سے بھی محروم رہتا ہے اور جاننے سے بھی۔

آدم و ابلیس کا قصہ

اسلام میں زندگی کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہر آدمی جو اس دنیا میں آتا ہے وہ اس لیے آتا ہے کہ وہ یہاں لوگوں کے درمیان رہ کر امتحان دے اور پھر اپنے عمل کے مطابق اپنا انجام پانے کے لیے دوبارہ خدا کے یہاں چلا جائے۔

آدمی کا امتحان کس چیز میں ہے، اس کو آدم اور ابلیس کے قصہ میں بتایا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (آدم) کو پیدا کیا تو فرشتوں سے اور ابلیس سے کہا کہ اس کے آگے جھک جاؤ۔ فرشتے فوراً خدا کے حکم کے مطابق آدم کے سامنے جھک گیے۔ مگر ابلیس جھکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا ہے اور مجھ کو آگ سے بنایا ہے۔ اس لیے میں آدم سے بہتر ہوں۔ میں آدم کے آگے نہیں جھکوں گا۔

اس وقت خدا نے آدم اور ابلیس دونوں کو زمین پر بھیج دیا۔ ابلیس نے کہا کہ میں آدم کی تمام نسل کو بہکاؤں گا۔ خدا نے کہا کہ: آدم کی اولاد میں جو لوگ تیری راہ چلیں گے تو میں تجھ کو اور ان کو سب کو دوزخ میں ڈال دوں گا (فمن تبعک منھم لاملئن جھنم منک ومن الناس اجمعین)

اب دیکھئے کہ ابلیس کی وہ راہ کیا تھی جس پر وہ چلا۔ وہ یہ تھی کہ اس کے اندر آدم کے مقابلہ میں بڑائی کی نفسیات آگئی (انا خیر منہ) اس نے سمجھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے میں آدم کے مقابلہ میں نہیں جھکوں گا۔ میں آدم کا احترام نہیں کروں گا۔

دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا معاملہ دوسرے شخص سے پڑتا ہے۔ اب اگر آپ ایسا کریں کہ سامنے کا آدمی جب آپ کو اونچا اور طاقت ور دکھائی دے تو آپ اس کا لحاظ کریں اور اس کا حق اسے دیں۔ اور جب سامنے کا آدمی نیچا اور کمزور نظر آئے تو اس کو نظر انداز کریں اور اس کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو یہ شیطانی طریقہ کی پیروی کرنا ہوگا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ آپ کا سلوک معلوم اصولوں کا پابند ہو۔ آپ ہر حال میں انھیں اعلیٰ اصولوں کی پابندی کریں، خواہ دوسرا فریق اونچا دکھائی دیتا ہو یا نیچا۔ خواہ وہ کمزور ہو یا طاقت ور۔

ایمان

قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو نجران سے آئے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا کچھ حصہ سنا۔ ان پر کھل گیا کہ یہ دین برحق ہے وہ اسی وقت ایمان لائے اور روتے ہوئے سجدے میں گر پڑے: واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا امنا فاکتبنا مع الشاھدین (المائدہ ۸۳)

اس آیت میں ایمان کو معرفت کہا گیا ہے (مما عرفوا من الحق) یعنی حق کو پہچان لینا۔ جس چیز کی پہچان ہو اسی کے لحاظ سے آدمی کے اندر تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا چونکہ سب سے بڑی طاقت ہے اس لیے خدا کی پہچان سے آدمی کے اندر عجز اور تضرع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ نجران کے لوگوں میں جب خدا کی معرفت پیدا ہوئی۔ جب ان پر خدا کی عظمت منکشف ہوئی تو ان کا سینہ پھٹ گیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر سجدے میں گر پڑے۔

اسی طرح صحیح مسلم میں ایک روایت ہے جو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے نقل ہوئی ہے۔ وہ کہتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من مات وھو یعلم انہ لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ (جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوگا)

اس حدیث میں ایمان کو علم کہا گیا ہے۔ یعنی جاننا، آگاہ ہونا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان ایک جاننے کا واقعہ ہے۔ وہ ایک شعوری دریافت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اسی قسم کا ایک گہرا تجربہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ڈسکوری (دریافت) کہا جاتا ہے۔ ایمان ایک ڈسکوری ہے۔ ایمان ایک ایسی ہستی کی موجودگی کو پا لینا ہے جو بظاہر ہمارے سامنے موجود نہیں۔ ایمان اس گہرے ادراک کا نام ہے جب کہ آدمی کے لیے غیب کا پردہ پھٹ جاتا ہے اور وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اسے دیکھنے لگتا ہے۔

ایمان بندے اور خدا کے درمیان اس اتصال کا قائم ہونا ہے جس کی ایک مادی مثال بلب اور پاور ہاؤس کے اتصال کی صورت میں ملتی ہے۔ بلب کا تعلق جب پاور ہاؤس سے قائم ہوتا ہے تو وہ اچانک چمک اٹھتا ہے، وہ وہ ہو جاتا ہے جو وہ پہلے نہیں تھا۔ اس کا اندھیرا اُجالے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بندہ جب اپنے رب کو حقیقی معنوں میں پاتا ہے تو اس کی ہستی خدا کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔ اس کے اندر ایسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو اس کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتے ہیں۔

صحابہ کرام کے لیے ایمان کا مطلب یہی تھا۔ صحابہ کرام کا ایمان ان کے لیے ایک زندگی سے نکل کر دوسری زندگی میں داخل ہونا تھا۔ یہ ان کے لیے تاریکی کے مقابلے میں روشنی کی دریافت تھی۔ حضرت حذیفہ ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کر رہے تھے تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: یارسول اللّٰہ کنّا فی جاھلیۃ وشر فجاءنا اللّٰہ بھذا الخیر (اے اللہ کے رسول، ہم جاہلیت اور شر میں تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس خیر کو لے آیا)

اس طرح جو ایمان ملتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو روایتی یا تقلیدی طور پر کسی آدمی کو مل جائے۔ تقلیدی ایمان آدمی کو متحرک نہیں کرتا جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کو دائمی طور پر متحرک کر دیتا ہے۔ تقلیدی ایمان سے آدمی کے اندر کوئی ذاتی نگاہ پیدا نہیں ہوتی۔ جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کے اندر ذاتی نگاہ پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ چیزوں کو دیکھے اور خود اپنی بصیرت سے فیصلہ کر سکے۔

تقلیدی ایمان سے صرف جامد عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ معرفت والا ایمان آدمی کے اندر انقلاب بن کر داخل ہوتا ہے، وہ آدمی کے فکر و عمل کی دنیا میں ایک ہیجان پیدا کرتا ہے۔ تقلیدی ایمان سے بے جان افراد پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ معرفت والے ایمان سے جاندار افراد ظہور میں آتے ہیں۔ اور جاندار افراد ہی وہ لوگ ہیں جو کہ تاریخ بناتے ہیں۔ جو انسانیت کے لیے کوئی نیا مستقبل ظہور میں لاتے ہیں۔

تقلیدی ایمان آدمی کو اپنی قوم سے ملتا ہے اور معرفت والا ایمان براہ راست اللہ تعالیٰ سے۔

مسلمان بھی

قدیم مکہ کے مشرکین اپنے آپ کو حضرت ابراہیم سے منسوب کرتے تھے۔ مگر انھوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ قرآن حضرت ابراہیم ہی کی اصل تعلیمات لے کر آیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین کی نظر میں حضرت ابراہیم کی وہ تصویر بسی ہوئی تھی جو ان کی قومی روایات کے ذریعہ بنی تھی۔ چوں کہ ان کی روایتی تصویر اور قرآن کی تصویر میں فرق تھا۔ اس لیے وہ قرآن کی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہے۔

یہی معاملہ یہود و نصاریٰ کا تھا۔ یہود حضرت موسیٰ پر فخر کرتے تھے اور نصاریٰ حضرت مسیح پر۔ مگر دونوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالاں کہ قرآن کی تعلیمات عین وہی تھیں جن کو لے کر حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح بھیجے گئے تھے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی روایات میں حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کی تصویر اس سے مختلف بنا رکھی تھی جو قرآن میں تھی۔ وہ دونوں میں مطابقت نہ پا سکے اس لیے وہ قرآن کے منکر بن گیے۔

یہی معاملہ مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اگرچہ قرآن اور سنت کی صورت میں پوری طرح محفوظ ہے۔ مگر عین ممکن ہے کہ آپ کے بعد مسلمانوں کے درمیان ان کی جو قومی روایات جمع ہوں ان میں پیغمبر اور قرآنی تعلیم کی تصویر بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ ایسی حالت میں جب قرآن کا بے آمیز دین ان کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ اس کو اپنے مانوس قومی دین کے مطابق نہ پائیں گے اور اس بنا پر قرآنی دعوت کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔ مسلمانوں کا اپنا بنایا ہوا دین ان کے لیے اصل اسلام کو سمجھنے میں اسی طرح رکاوٹ بن جائے گا جس طرح پچھلی قوموں کے لیے ان کا خود ساختہ دین رکاوٹ بن گیا تھا۔

مسلمانوں کے اپنے روایتی دین میں اگر ظواہر عبادت کی اہمیت ہو جائے تو وہ ایسی دعوت کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے جو حقیقت عبادت پر زور دے رہی ہو۔ مسلمانوں کے ذہن پر اگر اپنے اکابر کی عظمت چھا جائے تو خدائی عظمت کی باتیں ان کے ذوق کو اجنبی معلوم ہوں گی۔ مسلمانوں کے درمیان اگر تقلیدی مذہب کا رواج ہو جائے تو ایسی آواز ان کو غیر مانوس معلوم ہوگی جو براہ راست قرآن و سنت سے دین اخذ کرنے کی تلقین کر رہی ہو۔

تاریخ سے

راجر دوم (۱۰۹۵ - ۱۱۵۴) سسلی کا بادشاہ تھا۔ وہ نارمن سلطنت کا بانی تھا۔ قرون وسطیٰ کے مغربی بادشاہوں میں اس کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کا دارالسلطنت پلرمو (Palermo) تھا۔ راجر دوم نے سسلی کو ایک خوش حال ملک بنا دیا۔ ایک مضبوط انتظامیہ قائم کی۔ طاقت ور بحری بیڑہ تیار کیا۔ راجر دوم کو یہ کامیابی، ایک مغربی مورخ کے الفاظ میں، اس لیے ملی کہ اس نے سسلی کو یورپی اور عربی علماء کا مرکز بنا دیا تھا:

Roger made Sicily a meeting place of European and Arabic scholars. (VIII/634)

الادریسی اسی راجر دوم کا ہم عصر تھا۔ وہ مراکش میں پیدا ہوا۔ اس نے اسپین کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایشیا اور افریقہ اور یورپ کے سفر کیے۔ وہ علم جغرافیہ میں اپنے وقت کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ راجر دوم نے الادریسی کو سسلی بلایا تاکہ اس کے لیے وہ دنیا کا ایک نقشہ بنائے۔ الادریسی راجر دوم کا ایک قریبی دوست اور مشیر تھا۔ سسلی کے اس نارمن بادشاہ کے دربار میں الادریسی سرکاری جغرافیہ داں کے طور پر رہا:

Al-Idrisi was a close friend and adviser to Roger II, at whose court he served as official geographer. Roger II invited Al-Idrisi to Sicily to make a map of the world for him. (9/198)

گزرے ہوئے زمانہ میں مسلمانوں کو جو اونچا مقام ملا اور انھوں نے ساری دنیا میں اسلام کا جو غلبہ قائم کیا، اس کا راز یہی تھا۔ یہ عظمت انھیں نہ احتجاج اور مطالبہ سے ملی اور نہ تیر اور تلوار سے یہ عظمت انھیں صرف اس لیے ملی کہ وہ دنیا کے لیے مفید بنے۔ انھوں نے علوم و فنون میں اتنی ترقی کی کہ وہ دنیا کے فکری امام بن گیے۔ انھوں نے صدیوں تک انسانیت کی علمی رہنمائی کی۔ انھوں نے دنیا کو وہ دیا جو دنیا کے پاس موجود نہ تھا۔ یہی امامت کا راز ہے ماضی کے لیے بھی اور حال اور مستقبل کے لیے بھی۔

اختلاف رائے

حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ دو سردار خلیفہ اول کے پاس آئے۔ ان کا نام عُیَینَہ بن حِصن اور اقرع بن حابس تھا۔ ان دونوں کو فتح ہوازن کے بعد سو سو اونٹ دیے گئے تھے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر سے ایک زمین طلب کی۔ آپ نے تالیف قلب کے لیے انھیں یہ زمین دیدی اور ان کے لیے باقاعدہ ایک تحریر لکھ دی۔ عیینہ اور اقرع نے چاہا کہ دوسرے بڑے صحابہ کی تصدیق بھی اس عطیہ کے حق میں حاصل کر لیں۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عمر فاروق کے پاس گئے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے فرمان کو لے کر پھاڑ دیا:

جاء عيينة والاقرع يطلبان ارضاً الى ابى بكر فكتب له الخط فمزقه عمر وقال هذا شئ كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعطيكموه ليتألفكم على الاسلام والآن فقد اعزّ الله الاسلام واغنى عنكم. فرجعوا الى ابى بكر فقالوا الخليفة انت ام عمر فقال هو ان شاء ووافقه

(التفسیر المظہری، جلد ۴، صفحہ ۲۳۶)

عیینہ اور اقرع حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور ایک زمین طلب کیا۔ آپ نے ان کے حق میں ایک تحریر لکھ دی۔ پھر حضرت عمر نے اس تحریر کو پھاڑ دیا۔ اور کہا کہ یہ وہ چیز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کو تالیف قلب کے طور پر دیتے تھے۔ مگر اب اللہ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے اور تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا، وہی ہیں اگر وہ چاہیں اور انھوں نے حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کیا۔

یہ واقعہ تنقید کی ایک نہایت شدید مثال ہے۔ مگر اس شدید تنقید کو نہ تو حضرت ابوبکر نے بُرا مانا اور نہ صحابہ نے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں تنقید اور اختلاف رائے کی کتنی زیادہ آزادی دی گئی ہے۔

دو مثالیں

دمشق کی مسلم خلافت جس زمانہ میں ولید بن عبد الملک اموی کے ہاتھ میں تھی۔ خلیفہ کی طرف سے موسیٰ بن نصیر شمالی افریقہ کے حاکم تھے۔ اسپین میں مسلمانوں کا داخلہ انھیں موسیٰ بن نصیر کی ماتحتی میں انجام پایا۔ موسیٰ بن نصیر نے اولاً معلومات حاصل کرنے کے لیے سردار طریف کو ۵۰۰ آدمیوں کے ساتھ اسپین بھیجا۔ سردار طریف کی واپسی کے بعد طارق بن زیاد (ایک بربری غلام) کی سرداری میں سات ہزار کا لشکر روانہ کیا گیا۔ یہ لوگ مراکش کے ساحل سے کشتیوں پر روانہ ہوئے اور تقریباً دس میل کا سمندری سفر طے کر کے اسپین کے ساحل پر اتر گئے۔

طارق بن زیاد کو اسپین میں داخل ہوتے ہی ایک بڑی فوج سے سابقہ پیش آیا۔ طارق ابن زیاد کے ساتھ صرف سات ہزار آدمی تھے اور دوسری طرف ایک لاکھ کی فوج جو ہر لحاظ سے زیادہ مسلح اور زیادہ بہتر حالت میں تھی۔ ۲۸ رمضان ۹۲ ھ (جولائی ۷۱۱ء) کو دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس درمیان میں مزید ۵ ہزار فوج طارق کی مدد کے لیے مرکز سے آگئی۔ بارہ ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ عیسائیوں سے نہایت بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان کے اوپر فتح حاصل کی۔ اس طرح طارق ابن زیاد نے اسپین میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔

طارق بن زیاد نے فتح کی خبر اپنے امیر موسیٰ بن نصیر کے پاس روانہ کی۔ امیر موسیٰ بن نصیر نے اس کے جواب میں طارق بن زیاد کو لکھا کہ تم نے ملک کا جتنا حصہ فتح کیا ہے اسی پر قائم رہو اور اس سے آگے مت بڑھو۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر ۱۸ ہزار فوج کے ساتھ اسپین کی طرف روانہ ہوئے۔

امیر موسیٰ بن نصیر کا مذکورہ خط طارق بن زیاد کو ملا تو ان کی اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ ہوئی کہ اس وقت پیش قدمی سے رکنا درست نہیں ہے۔ ہم کو آگے بڑھ کر ملک کے بقیہ حصوں کو بھی فتح کرنا چاہیے ورنہ عیسائی طاقتیں اکٹھا ہو کر ہمارے اوپر حملہ کر دیں گی۔ اور ہمارے لیے موجودہ قبضہ کو باقی رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ طارق بن زیاد نے امیر کے مشورہ کے خلاف اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور قرطبہ اور طلیطلہ وغیرہ علاقے فتح کر ڈالے۔

امیر موسیٰ جب اسپین پہونچے تو وہ یہ دیکھ کر سخت ناراض ہو گئے کہ طارق نے ان کے حکم کی پروا

نہیں کی اور پیش قدمی جاری رکھی۔ امیر موسیٰ نے طارق کو اس حکم عدولی پر قید کر دیا۔ تاہم یہ صرف ایک ظاہری کارروائی تھی جو انھوں نے اس لیے کی کہ دوسرے سرداروں کو یہ سبق ہو جائے کہ ماتحت کے لیے افسر کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری ہے، وہ دل سے طارق کی بہادری اور حسن کارکردگی پر خوش تھے چنانچہ وقتی تنبیہ کے بعد امیر موسیٰ نے طارق کی اس طرح قدر دانی کی کہ ان کو اسپین کی تمام افواج کا سپہ سالار بنا دیا۔

یہ صورت جو طارق بن زیاد کے ساتھ پیش آئی تھی۔ یہی جلد ہی بعد خود موسیٰ بن نصیر کے ساتھ بھی پیش آئی۔ خلیفہ ولید بن عبد الملک کو جب موسیٰ بن نصیر کی فتوحات کا علم ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر اسپین کو فتح کر کے فرانس میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو لکھا کہ تم یورپ میں مزید پیش قدمی نہ کرو اور بلا تاخیر دمشق واپس آجاؤ۔ خلیفہ کے اس حکم کی تعمیل میں موسیٰ بن نصیر اندلس سے دمشق کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے اندلس کی حکومت اپنے لڑکے عبد العزیز کے سپرد کی اور کثیر مال غنیمت اور سونے چاندی کے ساتھ روانہ ہو کر مراکش اور مصر ہوتے ہوئے شام پہونچے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں خلیفہ ولید بن عبد الملک سخت بیمار ہو گیا جو اس کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔ ولید بن عبد الملک کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبد الملک تخت پر بیٹھنے والا تھا۔ سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ بن نصیر کثیر اموال کے ساتھ شام پہونچ گیے ہیں تو اس نے موسیٰ کے پاس پیغام بھیجا کہ تم ابھی باہر رُکے رہو اور دمشق میں داخل ہونے میں جلدی نہ کرو۔ سلیمان بن عبد الملک کا منشا یہ تھا کہ خلیفہ ولید کی وفات کے بعد امیر موسیٰ دمشق آئیں اور اسپین کا مال غنیمت میرے خلیفہ بننے کے بعد دربار میں لایا جائے۔ اس طرح میری تخت نشینی کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ مگر امیر موسیٰ سلیمان بن عبد الملک کے اس پیغام کی رعایت نہ کر سکے اور وہ تیزی سے سفر کر کے دمشق پہونچ گیے۔

امیر موسیٰ کے دربار میں حاضری کے صرف چند دن بعد خلیفہ ولید بن عبد الملک کی وفات ہو گئی اور ۱۶ جمادی الثانی ۹۶ ھ کو سلیمان بن عبد الملک خلیفہ قرار پایا۔ سلیمان بن عبد الملک کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ امیر موسیٰ کی حکم عدولی کو حسن نیت پر محمول کر کے معاف کر دے۔ مگر وہ ان کو معاف نہ کر سکا۔ اس نے امیر موسیٰ کے ساتھ سخت سلوک کیا حتیٰ کہ ان کو قید میں ڈال دیا۔ موسیٰ بن نصیر شدید مایوسی اور ناکامی کے عالم میں اگلے ہی سال ۹۷ ھ میں وفات پا گیے۔ بوقت وفات ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔

تزکیہ

قرآن میں پیغمبر کے دو خاص کام بتائے گئے ہیں ـــــــ تعلیم کتاب اور تزکیہ۔ تعلیم کتاب سے مراد قرآن کی تعلیم ہے۔ یعنی خدائی متن کو فرشتہ سے لے کر انسانوں تک پہنچانا۔ دوسری چیز تزکیہ ہے۔ تزکیہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ایجوکیٹ کرنا یا باشعور بنانا کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کے فکر کو ربانی فکر بنانا۔ ان کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنانا کہ وہ اس طرح سوچیں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ سوچا جائے۔ اور اس طرح فیصلہ کریں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم مصلحین اٹھے ان میں مشترک طور پر یہ بنیادی خامی پائی جاتی ہے کہ انھوں نے "تزکیہ" سے اپنے کام کا آغاز نہیں کیا۔ تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ مسلمانوں کے کچھ احوال اس کے سامنے آئے اور ان کو دیکھ کر وہ پرجوش طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ ذہن بنائے بغیر اس نے عملی اقدامات شروع کر دئے ـــــــ کسی نے انگریزی استعمار سے بگڑ کر جہاد آزادی کا نعرہ لگا دیا۔ کوئی مغربی تہذیب کے غلبہ کو دیکھ کر میدان عمل میں آگیا۔ کسی کو "شردھانند" کے قتل کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے مجاہد اسلام بنا دیا۔ کوئی شدھی سنگھٹن کی تحریک سے بے چین ہو کر سرگرم عمل ہو گیا۔ کسی کو مسلم خلافت کے زوال نے جان دینے پر آمادہ کر دیا۔ وغیرہ

یہ سب کام کا غیر پیغمبرانہ طریقہ ہے۔ کام کا پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو تزکیہ سے شروع کیا جائے نہ کہ اقدام سے۔

تزکیہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ افراد کو دین کا صحیح علم حاصل ہو جائے۔ وہ صحیح دینی انداز میں سوچنا جان لیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ غیر اسلامی نقطۂ نظر کے مقابلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو پہچان سکیں۔ وہ مختلف قسم کے حالات میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ کس وقت انھیں کیا کرنا ہے اور کس وقت انھیں کیا نہیں کرنا ہے۔

تزکیہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ افراد کے اندر زمانہ شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ وہ جان لیں کہ دنیا کے حالات کیا ہیں اور ان حالات میں دین کو کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔

گھمنڈ کا نقصان

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ جولائی ۱۹۸۵) نے لتا منگیشکر کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے۔ یہ انٹرویو نیویارک میں لیا گیا تھا۔ لتا منگیشکر ہندستان کی مشہور ترین خاتون سنگر ہیں۔ انٹرویور نے ان سے کہا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کی مقبولیت نے آپ کو مغرور بنا دیا ہے۔ خاتون سنگر نے اس کا جو جواب دیا وہ اخبار کے الفاظ میں یہ تھا:

> Surely, I'm no tyrant. I cannot afford to be nasty or arrogant. The day that happens — and I assure you it never will — there would be no sweetness in my music.

یقینی طور پر میں مغرور نہیں ہوں۔ میں بدطینت اور مغرور ہونے کا تحمل نہیں کر سکتی۔ جس دن ایسا ہوگا، اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا، اس دن میرے گانے میں کوئی مٹھاس باقی نہیں رہے گی۔

یہ اگرچہ ایک سنگر کی بات ہے مگر سنگر نے اس میں ایک بڑی اہم حقیقت بیان کر دی ہے۔ یہ حقیقت ایک داعی کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ایک سنگر کے لیے۔

انسان کا اصل حسن تواضع ہے نہ کہ گھمنڈ۔ گھمنڈ کرنے والے آدمی کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ مگر جو شخص تواضع اختیار کرے اس کے اندر اپنے آپ ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ متکبر کی آواز کڑوی آواز ہوتی ہے اور متواضع انسان کی آواز میٹھی آواز۔

خدا کا داعی خدا کے گیت گانے والا ہوتا ہے۔ وہ انسانی زبان میں ابدی حقیقت کے نغمے بکھیرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا سینہ تواضع اور نرمتا سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے اپنے آپ کو انا کے جذبہ سے خالی کر رکھا ہو۔ جس شخص میں یہ بات ہوگی اسی کی زبان سے وہ میٹھے بول نکلیں گے جو لوگوں کو تڑپائیں۔ وہی وہ گیت چھیڑ سکے گا جو روحوں میں وجد پیدا کر دیں۔ سچائی کی عظمت کو وہی شخص بیان کر سکتا ہے جس کا دل ذاتی عظمت سے اس طرح خالی ہو جائے کہ وہ ذاتی عظمت کے احساس کا تحمل نہ کر سکے۔

نکاح وطلاق

ایک مرد اور ایک عورت جب اپنے آپ کو نکاح کے رشتہ میں وابستہ کرتے ہیں تو ہمیشہ اسی جذبہ کے تحت وابستہ کرتے ہیں کہ دونوں ساری عمر ایک ساتھ رہیں گے اور ایک ساتھ زندگی گزاریں گے۔ اس کے بعد جب قدرت ان کے درمیان ایک بچہ پیدا کرتی ہے تو یہ گویا ایک قسم کی زنجیر ہوتی ہے جو اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ دونوں زیادہ گہرائی اور پائداری کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں مغربی ملکوں کے اعداد وشمار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ بے اولاد جوڑوں میں طلاق کا رجحان اس سے زیادہ پایا گیا جتنا کہ ان جوڑوں میں جو صاحب اولاد ہیں:

Childless couples tend to have a higher divorce rate than couples with children. (7/163-64)

ایک مغربی جج نے اپنے فیصلہ میں اس فطری حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ ہر چھوٹا بچہ جو ایک جوڑے کے یہاں پیدا ہو وہ ایک مزید ضمانت ہے کہ ان کی شادی کسی طلاق کی عدالت میں کبھی ختم نہ ہوگی:

Every little youngster born to a couple is an added assurance that their marriage will never be dissolved in a divorce court.

تاہم اس قسم کی تمام فطری اور نفسیاتی بندھنوں کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرد یا عورت یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو جانا چاہیے۔ قدیم زمانہ میں یہ صورت حال بہت کم پیش آتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں، خاص طور پر مغربی ملکوں میں، طلاقوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

طلاق زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ مگر طلاق کی کثرت بلاشبہ ایک [illegible] تر ہے جو موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت پیدا ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک سبب عورتوں کے لیے [illegible] زگار کی آسانی بھی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ صنعتی دور نے [illegible] توں کے لیے یہ بات زیادہ آسان کر دی کہ وہ اپنی معاشش خود حاصل کر سکیں، خواہ وہ تنہا ہوں یا [illegible] ی شدہ

ہوں یا مطلقہ ہوں یا بیوہ ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ بات دل چسپی کے ساتھ نوٹ کرنے کی ہے کہ ۱۹۳۰ کے بعد کے زمانہ میں پیدا ہونے والی عظیم کساد بازاری نے امریکہ میں طلاقوں کے اضافہ کی تعداد کو ایک عرصہ کے لیے روک دیا تھا:

Industrialization has made it easier for women to support themselves, whether they are single, married, divorced, or widowed. In this connection, it is interesting to note that the Great Depression of the 1930s stopped the rise in the number of divorces in the United States for a time. (7/163)

طلاق کا حکم

نکاح کا مسئلہ زندگی کا اصل مسئلہ ہے جب کہ طلاق کا مسئلہ صرف ایک استثنار ہے۔ تاہم چوں کہ ایسا استثنار بار بار پیش آتا ہے اس لیے الٰہی قانون اور وضعی قانون دونوں میں اس کی بابت احکام مقرر کیے گیے ہیں۔

الٰہی شریعت کی صحیح اور کامل نمائندگی اب صرف وہ ہے جو قرآن کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے۔ قرآن میں، اور اسی طرح اس کی مستند شرح کے طور پر سنت میں، طلاق کی بابت بہت سے احکام دیئے گیے ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ طلاق انتہائی ناگزیر حالات میں دی جائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کو ابغض المباحات (سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلال) کہا گیا ہے۔ اور دوسری چیز یہ کہ جب طلاق کا معاملہ کیا جائے تو اس طرح کیا جائے کہ دونوں عزت اور شرافت کے ساتھ علٰحدہ ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک یا دوسرے کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہو جائے اور وہ فریق ثانی کو بے عزت یا بے سہارا کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

قرآن میں طلاق کے حکم کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے: وسرحوهن سراحاً جميلاً (الاحزاب ۴۹) یعنی جب انھیں طلاق دے کر رخصت کرو تو بھلے طریقہ سے اور شریفانہ انداز سے رخصت کرو۔

متاع کا مطلب

طلاق کے احکام میں سے ایک حکم وہ ہے جس کے لیے قرآن میں "متاع" کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلہ میں سورہ البقرہ کی دو آیتیں حسب ذیل ہیں:

لاجناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضۃ ومتعوھن علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ متاعاً بالمعروف حقاً علی المحسنین (۲۳۶)	تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اس وقت طلاق دو کہ ان کو تم نے ہاتھ نہ لگایا ہو اور ان کے لیے کچھ مہر مقرر نہ کیا ہو۔ اور ان کو کچھ دو، وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق ہے، دستور کے مطابق۔ لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ......
وللمطلقات متاع بالمعروف حقاً علی المتقین (۲۴۱)	اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو فائدہ دینا ہے دستور کے موافق۔ لازم ہے پرہیزگاروں کے لیے۔

فقہی تفصیلات سے قطع نظر، پہلی آیت (۲۳۶) کا سادہ مطلب یہ ہے کہ نکاح کے وقت اگر مہر نہیں ٹھہرایا گیا تھا اور نہ مرد نے عورت کو ہاتھ لگایا تھا، اور اس سے پہلے مرد نے طلاق دیدیا تو مرد پر لازم ہے کہ عورت کو رخصت کرتے ہوئے اسے کچھ دے۔ یہ دینا اپنی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ ایسی صورت میں مہر دینا لازم نہیں۔

دوسری آیت (۲۴۱) میں یہی حکم عمومی انداز میں طلاق کے تمام واقعات کے لیے ہے۔ جب بھی کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے تو آخری علٰحدگی کے وقت اس کو چاہیے کہ حسن جدائی کی علامت کے طور پر عورت کو کچھ دے۔ مثلاً کپڑا یا اور کوئی چیز۔ بعض فقہاء کے نزدیک پہلی صورت میں "متاع" دینا ضروری ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں متاع دینا صرف مستحب ہے۔

مزاج شریعت

اس آیت کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان ضمنی اختلافات ہیں۔ تاہم یہ بات تمام فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے کہ اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد وقتی طور سابق بیوی سے کیا سلوک کیا جائے۔ اس مسئلے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ طلاق اور علٰحدگی کی تکمیل کے باوجود مطلقہ عورت کو مرد کی طرف سے مستقل گذارہ (Maintenance) دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسرا تصور تمام تر جدید تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہ تصور کبھی بھی الٰہی شریعت میں نہیں پایا گیا ہے۔ نہ اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کی آسمانی شریعتوں میں۔ مسلم فقہاء

کے درمیان آیت کے عملی انطباق کے سلسلہ میں بہت کچھ جزئی اختلافات ہیں ۔ مگر فقہاء میں سے کسی کی بھی یہ رائے نہیں ۔ اس آیت کے تحت مرد کے اوپر لازم ہے کہ وہ باقاعدہ طلاق واقع ہونے کے بعد بھی مستقل طور پر اپنی سابقہ بیوی کو گذارہ دیتا رہے ۔ ایک شخص بطور خود اس قسم کا خیال ظاہر کرے ۔ مگر قرآن یا حدیث کے اندر اس کے حق میں کوئی دلیل یا ماخذ موجود نہیں ۔ اور نہ اسلامی فقہاء میں سے کسی بھی فقیہہ کی یہ رائے ہے ۔

اسلامی فقہ میں اسی لیے اس مُتعہ کو مُتعہ طلاق کہتے ہیں نہ کہ مُتعوحیات ، یعنی وہ مُتعہ (کچھ مال) جو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت عورت کو دیا جائے ۔

قرآن ہر مسئلہ کو فطری انداز میں حل کرنا چاہتا ہے ۔ اس لحاظ سے یہ بات سراسر قرآنی روح کے خلاف ہے کہ جس مرد سے نباہ نہ ہونے کی بنا پر عورت کی جدائی ہوئی ہے اسی مرد سے اس عورت کا نفقہ دلوایا جائے ۔ یہ چیز سماج میں منفی ذہنیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی ۔ چنانچہ قرآن میں نکاح وطلاق کے احکام کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے :

وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعتہ وکان اللہ واسعا حکیما (النساء ۳۰)	اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کر دے گا اور اللہ وسعت والا حکمت والا ہے ۔

اللہ کی وسعت سے مراد وہ وسیع فطری نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے بندوں کے لیے مہیا کر رکھا ہے ـــــ عورت کو جب طلاق ہو جائے تو اس کے تمام خونی رشتوں میں فطری طور پر اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کسی دباؤ کے بغیر اس کی مدد اور سرپرستی کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ خود عورت کے اندر نئی قوت ارادی ابھرتی ہے اور وہ اپنے مسئلہ کے حل کے لیے اکثر ایسے کام کر ڈالتی ہے جو اس نے اس سے پہلے سوچا بھی نہیں تھا ۔ سابقہ تجربات اس کو زیادہ سمجھ دار اور محتاط بنا دیتے ہیں اور اس طرح وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ اگر وہ دوبارہ کسی سے رشتۂ نکاح میں منسلک ہو تو زیادہ کامیابی کے ساتھ رشتہ کو نباہ سکے ۔ وغیرہ

طلاق کے بعد

اس سلسلہ میں دوسرا سوال یہ ہے کہ طلاق کے بعد ایک عورت کے لیے اپنے ضروری

اخراجات پورا کرنے کی صورت کیا ہے۔ اس کا ایک جواب اسلام کا قانونِ وراثت ہے۔ اسلام نے خاندانی جائداد میں عورتوں کا جو حصہ مقرر کیا ہے اگر اس پر باقاعدہ عمل درآمد ہو تو عورت کے لیے بے سہارا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ خاندانی جائداد میں عورت کا مستقل حصہ مقرر کرنا ایک اعتبار سے اسی لیے ہے کہ عورت ہنگامی حالات میں اپنی کفالت آپ کر سکے۔

تاہم اسلام نے عورت کے معاشی مسئلہ کو تمام تر وراثت پر منحصر نہیں رکھا۔ کیوں کہ وراثت کا معاملہ ہمیشہ یقینی نہیں ہوتا۔ اس کا مزید انتظام اسلام کے قانونِ نفقات میں موجود ہے۔ اس سوال کی اہمیت مسلّم ہے۔ مگر اس کا تعلق قانونِ طلاق سے نہیں ہے بلکہ قانونِ نفقات سے ہے۔ آدمی کو اس کا جواب اسلام کے قانونِ نفقات میں تلاش کرنا چاہیے نہ کہ اسلام کے قانونِ طلاق میں۔ یہاں ہم مختصراً چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

۱۔ مطلقہ عورت اگر بے اولاد ہے یا اولاد کمانے کے قابل نہیں ہے تو اسلامی شریعت کے مطابق اس کے اخراجات کی ذمہ داری اس کے والد پر ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہی صورت دوبارہ لوٹ آئے گی جو شادی سے پہلے تھی۔ شادی سے پہلے باپ اپنی لڑکی کا کفیل تھا، طلاق کے بعد دوبارہ وہ اپنی لڑکی کا کفیل ہو جائے گا:

فالاناثُ علیہ نفقتُھن الیٰ ان یتزوَّجن اذا لم یکن لھنَّ مال ولیس لہ ان یواجرھن فی عمل ولا خدمۃ وإن کان لھنَّ قدرۃ واذا طلقت وانقضت عدتھا عادت نفقتھا علی الاب

فتح القدیر، جلد ۳، صفحہ ۳۴۴

باپ پر اس کی لڑکیوں کا نفقہ اس وقت تک ہے جب تک وہ شادی نہ کریں جب کہ لڑکیوں کے پاس مال نہ ہو۔ اور باپ کو حق نہیں کہ وہ انھیں کسی عمل یا خدمت پر لگائے، اگرچہ ان کے اندر اس کی قدرت کیوں نہ ہو۔ اور جب لڑکی کو طلاق ہو جائے اور اس کی عدت پوری ہو جائے تو اس کا نفقہ دوبارہ باپ پر لوٹ آئے گا۔

۲۔ مطلقہ عورت اگر ماں ہے۔ یعنی وہ ایسی اولاد رکھتی ہے جو صاحبِ معاش ہے تو ایسی صورت میں اس کے اخراجات کی پوری ذمہ داری اس کی اولاد پر ہوگی:

انّ جمیعَ ما وجب للمرأۃ وجبَ للاب

وہ سب جو بیوی کے لیے واجب ہے وہ سب

والأم على الولد من طعام وشراب وكسوة وسكنى حتى الخادم

باپ اور ماں کے لیے لڑکے پر واجب ہوگا، یعنی کھانا، پینا، کپڑا، مکان، یہاں تک کہ خادم بھی۔

رد المحتار علی الدر المختار، جلد ۲، صفحہ ۹۳۳

۳۔ اگر مطلقہ عورت کا باپ نہ ہو یا اس کی اولاد اس کی کفالت کرنے کے قابل نہ ہو تو دوسرے قریبی اور محرم اعزہ اس کی معاشی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ مثلاً چچا، بھائی، وغیرہ۔ اگر یہ تیسری صورت بھی موجود نہ ہو تو اسلامی شریعت کی رو سے ریاست کا بیت المال اس کے اخراجات کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ مطلقہ عورت کو قانونی طور پر یہ حق ہوگا کہ وہ ریاست سے اس کو وصول کرے۔

شریعت کے اسی اہتمام و انتظام کی وجہ سے اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ آج ایسا ہے کہ مسلمان عورتیں طلاق پاکر بے سہارا پڑی ہوئی ہوں اور کوئی ان کی کفالت اور سرپرستی کرنے والا موجود نہ ہو۔

تہذیب جدید کا مسئلہ

موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب نے بہت سے مسئلے پیدا کیے ہیں۔ یہ مسئلے حقیقی سے زیادہ مصنوعی ہیں۔ مغربی تہذیب نے بہت سے معاملات میں غیر فطری انداز اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں غیر فطری مسائل پیدا ہوئے۔ اس کے بعد مزید غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے غیر فطری طور پر ان کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مسائل میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انھیں میں سے ایک طلاق کا مسئلہ بھی ہے۔ مغرب میں آزادئ نسواں کے نام پر جو تحریک شروع ہوئی وہ اپنے ابتدائی جذبہ کے اعتبار سے بالکل غلط نہ تھی۔ مگر اس کے علم بردار اس کی حد کو نہ جانتے تھے۔ چنانچہ آزاد سماج بنانے کی کوشش بالآخر اباحیت پسند سماج (Permissive society) تک جا پہونچی۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان لامحدود اختلاط شروع ہوگیا۔ اس نے نکاح کے بندھن کو کمزور کر دیا۔ مرد اور عورت میاں اور بیوی نہ رہے بلکہ حدیث کے الفاظ میں ذواقین اور ذواقات بن گیے۔ اس کو مزید تقویت صنعتی دور کی اس آسانی سے حاصل ہوئی کہ عورت فوراً ہی اپنے لیے آزاد معاش حاصل کرسکتی تھی۔ جدید صنعتی معاشرہ میں ایک عورت جتنی آسانی سے اپنے لیے ذریعہ معاش حاصل کرلیتی ہے

وہ اس سے پہلے کبھی عورت کے لیے ممکن نہ تھا ۔ اس کی وجہ سے مرد کی قوامیت متاثر ہوئی اور عورتیں مرد کے زیر اثر رہنے پر راضی نہ ہو سکیں اور معاشرتی زندگی میں وہ مسائل پیدا ہوتے جنھوں نے طلاقوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھادی ۔

طلاق کو روکنے کے لیے مغربی حکماء نے یہ تدبیر کی کہ مرد پر یہ قانونی پابندی لگادی کہ طلاق کے بعد بھی اس پر لازم ہوگا کہ وہ عورت کو گزارہ دیتا رہے ۔ یہ گزارہ مغربی معیار کے مطابق مقرر ہوا ۔ چنانچہ اکثر حالات میں طلاق کے معنی مرد کے لیے یہ ہوگئے کہ وہ اپنے سرمایہ کا بڑا حصہ اپنی مطلقہ بیوی کو دیدے اور مزید زندگی بھر کما کما کر اس کا حصہ اسے ادا کرتا رہے ۔

اس غیر فطری صورت حال کی ایک مثال لارڈ برٹرینڈ رسل ہے ۔

برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ - ۱۹۷۰) ایک نہایت ذہین اور تعلیم یافتہ انگریز تھا ۔ اس کو ایک ایسی عورت درکار تھی جو اس کی ذہنی سطح کے مطابق اس کی رفیق حیات بن سکے ۔ اس نے شادی کی مگر تجربہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اس کی پسند کے مطابق نہیں ہے ۔ ناموافقت ظاہر ہونے کے بعد اس نے فوراً اس سے علٰحدگی اختیار نہیں کی ۔ سخت ذہنی اذیت کے باوجود اس کے بعد بھی وہ تقریباً دس سال تک اس کے ساتھ نباہ کرتا رہا ۔ آخر کار اس نے اس کو طلاق دے کر دوسری شادی کی ۔ دوسری عورت سے بھی نباہ نہ ہو سکا اور پھر اس کو چھوڑ کر برٹرینڈ رسل کو تیسری شادی کرنی پڑی ۔

یہ طلاق برٹرینڈ رسل کو بہت مہنگا پڑا ۔ طلاق کے بعد اس کو از روئے قانون اپنی بیویوں کو جو رقم ادا کرنی پڑی اس نے برٹرینڈ رسل کی معاشیات کو برباد کر دیا ۔ چنانچہ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے :

The financial burden was heavy and rather disturbing: I had given £ 10,000 of my Nobel Prize cheque for a little more than £ 11,000 to my third wife, and I was now paying alimony to her and to my second wife as well as paying for the education of my younger son. Added to this, there were heavy expenses in connection with my elder son's illness; and the income taxes which for many years he had neglected to pay now fell to me to pay.

Bertrand Russell, *Autobiography*, Unwin Paperbacks, 1978, pp. 563-64.

مالیاتی بوجھ میرے اوپر بہت بھاری اور پریشان کن تھا ۔ مجھ کو اپنے نوبیل انعام کے گیارہ ہزار پاؤنڈ میں سے دس ہزار پاؤنڈ اپنی تیسری بیوی کو دے دینا پڑا ۔ اور اب میں اس کو اور اپنی دوسری بیوی کو نان نفقہ کی رقم بھی ادا کر رہا تھا ۔ اور اسی کے ساتھ اپنے چھوٹے بچے کی تعلیم کی ادائیگی بھی میرے ذمہ تھی ۔ مزید اضافہ یہ کہ میرے بڑے لڑکے کی بیماری کے سلسلہ میں بھی بھاری اخراجات تھے ۔ اور اس لڑکے کا کئی سال کا انکم ٹیکس

جو وہ ادا نہیں کر سکا تھا وہ بھی مجھ کو ہی ادا کرنا پڑا۔

مغرب کا یہ قانون بظاہر عائلی زندگی میں اصلاح کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر وہ مغربی ممالک کے لیے الٹا پڑا۔ برٹرینڈ رسل کے مذکورہ تجربہ جیسے تجربات بے شمار لوگوں کو پیش آئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں انھیں اس کی بہت بڑی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ لوگوں کو نکاح کا طریقہ بے حد مہنگا معلوم ہوا۔ حتیٰ کہ ان کے اندر نکاح کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت اور مرد نکاح کے بغیر ایک ساتھ رہنے لگے۔ چنانچہ آج مغرب کی نئی نسل میں ۵۰ فیصد سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو غیر منکوحہ بیویوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

ہندستان کا تجربہ

طلاق کو مشکل بنانے کا دوسرا تجربہ وہ ہے جو ہندستان میں پیش آیا۔ ہندستان کے قدیم مصلحین نے بظاہر عورت کے تحفظ کے لیے مذہبی طور پر طلاق کو ممنوع قرار دے دیا۔ مزید یہ کہ عورت کے اندر طلاق کا رجحان روکنے کے لیے انھوں نے یہ کیا کہ طلاق کے بعد عورت کے لیے نکاح ثانی کا راستہ تمام تر بند کر دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو قوانین بنائے اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک بار جب شادی ہو جائے تو اس کے بعد نہ مرد اسے طلاق دے سکتا ہے اور نہ عورت کے لیے ممکن ہے کہ وہ پہلے شوہر سے جدائی کے بعد دوسرا نکاح کر سکے۔

مگر یہ اصلاح غیر فطری تھی چنانچہ ہندو سماج کو اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑی۔ عورت اور مرد اگر نکاح کے بعد ایک دوسرے کو مطمئن نہ کر سکے تو ان کی ساری زندگی بدترین تلخی میں گزرتی تھی۔ کیوں کہ نہ مرد کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور نہ عورت کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے جدا ہو کر اپنا دوسرا نکاح کر سکے۔ اس کے لیے صرف یہ ممکن تھا کہ ساری عمر ایک غیر مطلوب مرد کے ساتھ پُر اذیت زندگی گزارتی رہے اور اگر اس کا شوہر درمیان میں مر جائے تو اپنے آپ کو جلا کر ستی ہو جائے۔

موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ نے نئی شکل اختیار کی ہے۔ قانونی طور پر اگرچہ علٰحدگی یا نکاح ثانی کو جائز کر دیا گیا ہے مگر ہندو سماج عملاً آج بھی انھیں روایات پر چل رہا ہے جو ہزاروں برس سے اس کے درمیان بنی ہیں۔ چنانچہ ہندو عورتوں کے بارہ میں کثرت سے اطلاعات مل رہی ہیں کہ وہ شوہروں سے ناموافقت کی بنا پر خودکشی کر لیتی ہیں۔ اس کا سبب مذکورہ بالا مسئلہ ہے۔ یہ عورتیں جانتی ہیں کہ اولاً تو شوہروں سے علٰحدگی مشکل ہے اور اگر کسی طرح علٰحدگی ہو جائے تو دوسرا نکاح اس سے بھی زیادہ مشکل۔

مذہب کی حقیقت

مذہب ابتداءً خدائی مذہب کے طور پر شروع ہوتا ہے اور بعد کے زمانہ میں وہ انسانی مذہب بن جاتا ہے۔ اس میں کسی بھی مذہب کا کوئی استثنار نہیں، حتیٰ کہ اسلام کا بھی نہیں، اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے مذاہب عملی طور پر بھی انسانی مذاہب بنے اور ان کی کتابیں بھی محرف ہو کر انسانی کتابیں بن گئیں۔ جب کہ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ اس کو ماننے والے اگرچہ بعد کے زمانہ میں اپنے علمار اور بزرگوں سے دابستہ ہو گیے۔ مگر قرآن اور سنت کی شکل میں اس کا جو متن ہے وہ آج بھی اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں کامل طور پر محفوظ ہے۔

مذہب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اس کا نام ہے کہ انسان اس حقیقت کو پالے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے اور وہ اپنے تمام اعمال کے لیے اس خالق و مالک کے سامنے جواب دہ ہے۔ خدا کی دریافت اور اس کے سامنے اپنی جواب دہی کے احساس سے جو زندگی بالکل لازمی نتیجے کے طور پر ابھرتی ہے اسی کا نام مذہبی زندگی ہے۔

اس کے بعد آدمی ایک نیا آدمی بن جاتا ہے۔ یہ دریافت آدمی کے لیے ایک ایسی عظیم حقیقت کی دریافت ہوتی ہے جو اس سے ذاتی بڑائی کے تمام احساسات کو چھین لے۔ ایسا آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی زبان پر خدا کی لگام لگی ہوئی ہے۔ وہ عمل کرتا ہے تو اس طرح کرتا ہے جیسے وہ خدا کی گائڈ بک اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ جب وہ کسی سے معاملہ کرتا ہے تو اس طرح معاملہ کرتا ہے جیسے اس کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہو۔

یہی اصل مذہب ہے۔ اور یہی وہ مذہب ہے جو تمام پیغمبروں کو دیا گیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں لوگ خدائی مذہب کو چھوڑ کر اپنے بزرگوں کے مذہب پر چل پڑے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کا حال بھی اس معاملہ میں دوسروں سے کچھ مختلف نہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی اہتمام کے تحت قرآن کو کامل طور پر محفوظ کر رکھا ہے۔ جو اللہ کا بندہ خدا کی مرضی کو جاننا چاہے اسے قرآن پڑھنا چاہیے۔ کسی اور ذریعہ سے وہ خدا کے دین کو نہیں پا سکتا۔ دوسری کتابوں میں بگڑا ہوا دین ہے اور قرآن میں محفوظ دین۔

ایک سفر

آئن سٹائن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی نے ایک بار اس کو پانچ سو پونڈ کا ایک چیک دیا۔ آئن سٹائن کو اس کا کیش کرانا یاد نہ رہا۔ وہ اس چیک کو اپنے مطالعہ کے دوران بُک مارک (Book mark) کے طور پر استعمال کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی مقررہ مدت گزر گئی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ حال میں میرے ساتھ پیش آیا۔ مارچ ۱۹۸۴ میں میں جامعہ اسلامیہ کی دعوت پر مدینہ منورہ گیا تھا۔ اسی وقت یہ پروگرام تھا کہ واپسی کے بعد مجھے حیدر آباد کا سفر کرنا ہے۔ جامعہ اسلامیہ (مدینہ) کے ذمہ داروں نے ازراہِ عنایت دہلی اور حیدر آباد کے درمیان سفر کے لیے فرسٹ کلاس کا ایک ایر ٹکٹ بنوا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس ٹکٹ کا حوالہ نمبر یہ ہے:

065/4403/270/732 (Saudia, Medina, 10-3-1984)

یہ ٹکٹ ۱۰ مارچ ۱۹۸۴ سے ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ تک کے لیے تھا۔ مگر دن گزرتے رہے اور میں حیدر آباد کا پروگرام نہ بنا سکا۔ اب حیدر آباد کا سفر پیش آیا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ کی مدتِ استعمال ختم ہو چکی ہے۔ ٹکٹ قانونی طور پر بیکار ہو گیا تھا۔ چنانچہ حیدر آباد کے سفر کے لیے مجھ کو دوسرا ٹکٹ لینا پڑا۔ یہ صرف میری بھول تھی۔ ورنہ مذکورہ ٹکٹ جو سعودی ایرلائنز (مدینہ) سے اشو کیا گیا تھا۔ اس پر واضح طور پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: ان ھٰذہٖ التذکرۃ ھی صالحۃ للنقل لمدۃ سنۃ واحدۃ من تاریخ اصدارھا (یہ ٹکٹ اپنے تاریخ اجراء سے ایک سال تک کے لیے لائق استعمال ہے)

انسان ایک کام میں مشغول ہو تو وہ دوسرے کام کو بھول جاتا ہے۔ یہ صرف خدائے واحد کی صفت ہے کہ وہ بیک وقت ہر کام کو یاد رکھے خواہ کاموں کی فہرست کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو۔

دہلی سے جہاز چلنا شروع ہوا تو حسب معمول اناونسر نے اپنے اعلان میں کہا:

دلی سے حیدر آباد تک کی دوری ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں پوری کی جائے گی۔

یہ الفاظ میں نے سنے تو میرے دل نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب احسان ہے کہ اس نے

فاصلوں کو انسان کے لیے بالکل قریب کر دیا ہے۔ ۱۲ سو سال پہلے اموی شہزادہ عبد الرحمن الداخل دمشق سے روانہ ہوا تو اس کو اسپین تک پہونچنے میں پانچ سال لگ گئے۔ آج اس قسم کا سفر صرف چند گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔

۱۴ جولائی ۱۹۸۵ کی صبح کو میں دہلی سے حیدر آباد گیا اور ۱۵ جولائی کی صبح کو دہلی واپس آیا۔ ۱۳ جولائی کو میں جس جہاز سے گیا اسی سے آندھرا پردیش کے گورنر ڈاکٹر شنکر دیال شرما بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ نہایت شریف اور سادہ مزاج کے آدمی ہیں۔ اردو بہت اچھی جانتے ہیں۔ اور مسلم تہذیب سے قریب رہے ہیں۔ واپسی کے بعد ان کے نام الرسالہ اردو جاری کر دیا گیا ہے۔

۱۳ جولائی کی صبح کو جب میں حیدر آباد جانے کے لیے انڈین ایرلائنز کے جہاز نمبر ۴۰۳ میں بیٹھا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اس وقت میں اگر جہاز کا بیرونی رُخ دیکھنا چاہوں تو میں اس کو نہیں دیکھ سکتا ہوائی جہاز جب اپنے دونوں پروں کو پھیلائے ہوئے رن وے پر دوڑتا ہے اور جب وہ زمین سے فضا میں اڑان کرتا ہے تو یہ بڑا عجیب منظر ہوتا ہے۔ مگر جہاز کے مسافر کے لیے اس کا یہ منظر دیکھنا مقدر نہیں۔ کوئی شخص بیک وقت جہاز کا سوار اور جہاز کا مشاہد نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی آدمی جہاز کے ان مناظر کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو جہاز سے باہر آنا پڑے گا۔

یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا بھی ہے۔ آپ اگر دنیا میں داخل ہو کر اس سے متمتع ہونا چاہتے ہیں تو آپ دنیا کی حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ دنیا کی حقیقتوں کو گہرائی کے ساتھ جاننے کے لیے دنیا سے محرومی پر راضی ہونا پڑے گا۔ یہی بات حضرت مسیح نے ان الفاظ میں فرمائی

حیدر آباد میں پروگرام

۱۳ جولائی ۱۹۸۵	۱۱ بجے صبح	اسلامی مرکز (حمایت نگر) گفتگو، سوال و جواب
	۵ بجے شام	مدینہ ٹکنکل اسکول میں خطاب "تعمیر ملت"
۱۴ جولائی ۱۹۸۵	۱۱ بجے صبح	مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ، اسلام اور عصر حاضر
	۵ بجے شام	مسجد عامرہ، قرآن خدا کی کتاب

حیدر آباد کی مذکورہ چاروں تقریروں کا ٹیپ کئی لوگوں نے لیا، اسلامی مرکز میں بھی ان کا ٹیپ موجود ہے۔

کہ "تم خدا اور دولت دونوں سے ایک ساتھ محبت نہیں کرسکتے" اور یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے کہ ——— مازهد عبد فی الدنیا الا انبت اللہ الحکمۃ فی قلبہ وانطق بھا لسانہ وبصرہ عیب الدنیا داءھا ودواءھا)

جہاز جب بلندی پر اڑ رہا تھا تو میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف نظر ڈالی۔ اس وقت دیکھنے میں ایسا معلوم ہوا جیسے ہم سمندر کے اوپر اڑ رہے ہوں۔ پانی جیسی ہموار سطح کے درمیان جگہ جگہ سمندر کی جھاگ دار لہروں کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جلد ہی میری غلط فہمی دور ہوگئی جب مجھے یاد آیا کہ دہلی اور حیدرآباد کے راستہ میں کوئی سمندر نہیں ہے۔ یہ سارا سفر خشکی کے اوپر طے ہوتا ہے۔ یہ دراصل بادل تھے۔ جہاز چونکہ بادل کے اوپر سے اڑ رہا تھا اس لیے ہمارے نیچے سمندر کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

کچھ دیر سفر کرنے کے بعد "لہروں" کی اونچائی بڑھنا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی طرح اونچی دکھائی دینے لگیں۔ اس فرق کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ جہاز منزل سے قریب ہونے کی وجہ سے نیچے آنا شروع ہوا۔ جب تک ہم بادل سے دور تھے، وہ ہم کو سمندر کی لہروں یا کھیتوں کی مینڈھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جب ہم اس کے قریب آگئے تو وہ پہاڑ کی طرح بلند دکھائی دینے لگا۔

اکثر مشاہدات محض اضافی ہوتے ہیں مگر انسان غلطی سے ان کو حقیقی سمجھ لیتا ہے۔

حیدرآباد ایرپورٹ سے ہمارا قافلہ شہر کے لیے روانہ ہوا تو راستہ میں ایک صاحب نے کہا کہ "گلی قاسم جان" میں تو آپ سے ملنے کے لیے جانا ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ اطراف کی سڑکوں پر ہر وقت اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ کسی بھی سواری سے سفر کرنا سخت مشکل ہے، اب نئی دہلی میں مرکز کی موجودہ عمارت کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا کہ ہماری موجودہ عمارت کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں کھلی سڑکیں ہیں اور عمارت بھی بالکل پارک کے کنارے ہے۔ موصوف مسکرا کر بولے "دہلی کا مرکز پارک کے کنارے واقع ہے۔ مگر اس کی حیدرآباد کی شاخ ایسی ہے کہ خود اس کے اندر پارک واقع ہے۔"

حیدرآباد میں میرا قیام مرکز کی شاخ کی عمارت میں تھا جو یہاں ۱۹۸۳ سے قائم ہے۔

مغرب کے وقت ہم لوگ مرکز میں پہونچ گیے۔ ۱۰ بجے رات تک ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ کچھ نوجوان ملنے کے لیے آئے جو برابر الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ ایک نوجوان جو ایم بی اے (M.B.A.)

کا کورس کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ” الرسالہ فطرتِ انسانی کا ترجمان ہے۔ اسی لیے میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ اور اس کی پندرہ کاپی منگا کر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں پہونچاتا ہوں “

کچھ بزرگوں نے کہا کہ الرسالہ میں تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے کہا کہ تنقید کسی گروہ کے زندہ گروہ ہونے کی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے رسول اور اصحاب رسول کے واقعات بتائے کہ وہ لوگ تنقید اور اختلاف کو نہ صرف گوارا کرتے تھے بلکہ پسند کرتے تھے۔

پھر میں نے ایک واقعہ بتایا کہ ایک صاحب یورپ اور امریکہ کے کئی سالہ قیام کے بعد واپس آئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مغربی قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا :

ڈیسنٹ کو مقدس مقام دینا

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف (Dissent) زندگی کی اہم ترین قدر ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ بدر کے لیے ” اختلاف “ ہی کی وجہ سے زیادہ بہتر میدان کا انتخاب کیا جا سکا۔ ہم کو چاہیے کہ تنقید کو ختم کرنے کے بجائے تنقید کے بارہ میں لوگوں کی غیر ضروری حساسیت کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

حیدر آباد میں قیام کے درمیان ہر وقت لوگ آتے رہے اور ان سے مختلف دینی و ملّی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ۱۱ فروری کی صبح کو ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کے اندر قومی اور ملّی تعمیر کا کافی جذبہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتابیں وغیرہ تو نہیں پڑھی ہیں۔ تاہم میرے پاس فاضل زمین اور فاضل مکان ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس کو لے کر اس کو ملی تعمیر کے کام میں استعمال کریں۔

میں نے کہا کہ آپ کا جذبہ بہت قابل قدر ہے۔ مگر اتحاد عمل سے پہلے اتحاد خیال ضروری ہے پہلے ہم آپ ایک دوسرے کے ذہن کو سمجھیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ مل کر کام کریں گے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں نے بار بار ایک غلطی کی ہے۔ وہ مسائل (Issues) پر اتفاق کو اتفاق سمجھ لیتے ہیں اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں مگر جلد ہی اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے اور سب الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اشوز پر اتفاق رائے کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ کسی اشو کو

دمی کس زاویہ نظر سے دیکھتا ہے۔

مصر میں "فاروق ہٹاؤ" مہم پر بہت سے لوگ متحد ہوگیے مگر شاہ فاروق کے ہٹنے کے بعد جب "اسلام لاؤ" کا سوال آیا تو وہ ٹکرا کر الگ ہوگیے۔ پاکستان میں "بھٹو کا احتساب" کے نعرہ پر تمام اسلام پسند متحد ہوگیے۔ مگر بھٹو کے خاتمہ کے بعد اسلام کے نفاذ کا سوال ہوا تو وہ متحد نہ ہوسکے۔ ہندستان میں فساد کے مسئلہ پر تمام جماعتیں آل انڈیا مجلس مشاورت کے تحت متحد ہوگئیں۔ اس کے بعد ان کے لیڈر ایک دوسرے سے لڑکر الگ ہوگیے۔ مسلم یونیورسٹی کے سلسلے میں مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ:

کہ ایں سررشتہ تعلیم بادر دست ما باشد

جدوجہد کے بعد یہ مطالبہ پورا ہوگیا تو اب متحد ہوکر یونیورسٹی کو ترقی دینے کے بجائے وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشوز پر اتفاق کافی نہیں ہے۔ اشوز کے ساتھ زاویہ نظر میں بھی اتفاق ہونا لازمی طور پر ضروری ہے ورنہ تعمیر کے بجائے تخریب پیدا ہوگی۔

الرسالہ کیا ذہن پیدا کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ ان چند واقعات سے ہوگا جو اس سفر کے دوران میرے علم میں آئے۔

ایک تاجر باقاعدہ الرسالہ پڑھتے ہیں اور ہماری مطبوعات میں سے بھی اکثر پڑھ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں انکم ٹیکس محکمہ کی ریڈ (Raid) ہوئی۔ تاجر طبقہ جانتا ہے کہ "ریڈ" کسی تاجر کے لیے کس قدر بھیانک واقعہ ہوتا ہے۔ تاہم تاجر نے بتایا کہ ریڈ کرنے والی ٹیم جب ان کے دفتروں میں گھس گئی تو ان کو بالکل ڈر نہیں معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ آپ دیکھنا چاہتے ہیں دیکھ لیں۔ مگر ریڈ کے اس دنیوی واقعہ سے ان کا ذہن آخرت کی طرف مڑ گیا۔ انھوں نے سوچا ——— "اگر خدا اسی طرح ریڈ کر دے تو میں کیا کروں گا"

ایک صاحب نے اپنے مطالعہ کی روداد بتاتے ہوئے کہا کہ "میں نے آپ کے یہاں کی مختلف کتابیں پڑھیں۔ پھر میں نے احیاء اسلام پڑھی۔ احیاء اسلام کو پڑھتے ہوئے جب میں اس صفحہ پر پہونچا جہاں آپ نے جنت کا ذکر کیا ہے تو............ یہ کہتے ہوئے ان کی زبان اچانک بند ہوگئی۔ میں نے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ اس مجلس میں دوبارہ گفتگو

نہ کر سکے ۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ہمارا ایک کارخانہ ہے۔ یہ کارخانہ پہلے شہری علاقہ میں تھا۔ ہمارے پڑوسیوں کو شکایت تھی کہ تمہاری چمنی سے دھواں نکلتا ہے اور وہ ہمارے گھروں کو خراب کرتا ہے میں ہمیشہ جواب دیتا کہ ہمارا کارخانہ باقاعدہ سرکاری اجازت کے تحت قائم ہے۔ اگر آپ کو اعتراض ہے تو آپ جا کر مقدمہ قائم کیجیے۔ تاہم الرسالہ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں تبدیلی ہوئی۔ ایک روز میں اپنے کارخانہ سے نکلا۔ میرے ایک پڑوسی اپنے گھر کے باہر صحن میں سفید شیروانی پہن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر بلایا اور کہا کہ آپ میری شیروانی کو دیکھیے۔ آج ہی میں نے یہ دُھلی ہوئی شیروانی پہنی ہے اور وہ آپ کے کارخانہ کے دھوئیں سے کالی ہو رہی ہے۔ میں نے ان کی شیروانی پر کوئلہ کی راکھ دیکھی تو اچانک یہ خیال آیا۔ ”اگر میں اپنے پڑوسی کی جگہ پر ہوتا اور اس کے کارخانہ کی چمنی سے میری شیروانی کالی ہو رہی ہوتی تو میں کیا کرتا۔ میرے دل نے کہا کہ مجھے وہی شکایت ہوتی جو میرے پڑوسی کو ہو رہی ہے۔

اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے کارخانہ کو یہاں سے ہٹا دیں گے۔ چنانچہ ہم نے شہر کے باہر صنعتی علاقہ میں ایک بڑی زمین خریدی اور کارخانہ کو شہر سے اس نئے مقام پر منتقل کر دیا۔ پہلے ہمارا کارخانہ ایک ہزار گز زمین پر تھا۔ اب ہمارا کارخانہ پندرہ ہزار گز زمین پر ہے۔ نیز بہت سی سہولتیں جو شہر میں حاصل نہیں تھیں یہاں حاصل ہیں۔ ہم نے پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی کر لی ہے۔

ایک صنعت کار نے کہا کہ الرسالہ ہر آدمی کے لیے بہترین گائڈ ہے، میں نے اپنی کاروباری زندگی کے کئی مسائل الرسالہ کی تعلیمات کو استعمال کر کے حل کیے ہیں ۔

مرکز میں ایک فلسطینی نوجوان ملاقات اور انٹرویو کے لیے آئے ۔ انھوں نے مختلف سوالات کیے ۔ اسلامی مرکز کے مشن کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمارے نزدیک اصل کام عقیدہ کو زندہ کرنا اور عمل صالح کی روح پیدا کرنا ہے۔ سیاست اور حکومت اضافی چیزیں ہیں نہ کہ حقیقی چیزیں ۔

انھوں نے کہا کہ یہی تصور شیخ حسن البنا کا بھی تھا۔ میں نے کہا کہ پھر شیخ حسن البنا اور

ان کے ساتھی شاہ فاروق کو اس کے سیاسی تخت سے بے دخل کرنے کی مہم میں کیوں شریک ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ شاہ فاروق مصر میں اسلام کے احیار کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ اس لیے اس کو ختم کرنا ضروری تھا۔ میں نے کہا، کیا شاہ فاروق کے تخت سے ہٹنے کے بعد مصر میں اسلام کے احیار کی راہ ہموار ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ ظالم اگر ظلم کرے تو کیا اس کا ہاتھ نہ پکڑا جائے۔ میں نے کہا کہ کیا شیخ اور ان کے ساتھی ظالم کا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

اکثر لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ لوگ تضاد میں جیتے ہیں۔ اسی لیے وہ کوئی گہرا دینی کام نہیں کر پاتے۔ ایک طرف وہ دعوت حق کا نام لیتے ہیں، اور دوسری طرف قومی جھگڑوں اور سیاسی ہنگاموں کو اسلامی جہاد قرار دے کر اس میں بھی کود پڑتے ہیں۔ حالانکہ اس دنیا میں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ دہلی سے کلکتہ جانا چاہتے ہیں تو دہلی سے امرتسر کی ٹرین آپ کو چھوڑنی پڑے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ قومی جھگڑوں اور سیاسی ہنگاموں کو اسلامی جہاد بتا کر عوام کی لیڈری حاصل کریں۔ اور اسی کے ساتھ آپ کو دعوت الی اللہ اور شہادۃ علی الناس کے کام کی توفیق بھی حاصل ہو۔

لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ انھیں "کیا کرنا ہے" وہ اس سے بے خبر ہیں کہ انھیں "کیا نہیں کرنا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اقدامات کے باوجود انھیں کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ کرنے والے کام کی باتیں کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ نہ کرنے والے کام میں اپنے آپ کو الجھا دیتے ہیں۔ آج سب سے پہلا کام لوگوں کو اس بے شعوری سے نکالنا ہے۔ اس کے بغیر آگے کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے قبل میں تقریباً ڈیڑھ سال پہلے حیدر آباد گیا تھا۔ اس وقت ۱۱ فروری ۱۹۸۴ کی شام کو اسلامی مرکز کی شاخ حیدر آباد کا افتتاح ہوا تھا۔ جناب سید مکرم شاہ صاحب (چیرمین لیجسلیٹو کونسل، آندھرا پردیش) اور جناب سید ہاشم علی صاحب (موجودہ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) مہمان خصوصی کے طور پر اسٹیج پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو نہایت قیمتی مشورے دیے۔ مرکز کا وسیع لان پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ شہر کا تعلیم یافتہ طبقہ بہت بڑی تعداد میں اس موقع پر جمع ہو گیا تھا۔ اور اس نے آخر تک نہایت توجہ کے ساتھ تقریروں

کوسنا۔ آخر میں راقم الحروف کی تقریر ہوئی۔

اس کے بعد اب جولائی ۱۹۸۵ میں حیدرآباد کا سفر ہوا۔ اندازہ ہوا کہ اس مدت میں حیدرآباد میں اسلامی مرکز کی آواز پہلے سے زیادہ پھیل گئی ہے۔ ہر اجتماع میں غیر معمولی طور پر کافی زیادہ تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اور کثرت سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ اکثر لوگوں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں ہم کو پہلی بار سننے میں آرہی ہیں۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ مزید قیام کرکے اور زیادہ اجتماعات کیے جائیں اور حیدرآباد کے اطراف (محبوب نگر وغیرہ) میں بھی ضرور پروگرام رکھا جائے۔ مگر میرے لیے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا۔

۱۵ جولائی کی صبح کو میں واپس ہوکر دہلی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ یہاں مسافروں کا استقبال کرنے کے لیے ان کے عزیزوں اور دوستوں کے مسکراتے ہوئے چہرے موجود تھے۔ میرے دل نے کہا: ہر مسافر کے لیے وہ لمحہ بہت قریب آگیا ہے جب کہ اس کا ایک اور سفر ہو۔ دنیا سے آخرت کی طرف سفر۔ وہاں کسی کا استقبال کرنے کے لیے خدا کے فرشتے کھڑے ہوں گے۔ اور کوئی ہوگا جس کا وہاں کوئی استقبال کرنے والا نہ ہوگا۔ آہ کیسا عجیب ہوگا سفر کا یہ خاتمہ، کیسا عجیب ہوگا مسافروں کا یہ انجام۔

صدر اسلامی مرکز کی آواز میں ماہانہ "الرسالہ کیسٹ" خدا کے فضل سے پابندی سے تیار ہو رہا ہے اور ہر ماہ خریداروں کے نام روانہ کیا جا رہا ہے۔ موجودہ منصوبہ کے مطابق دسمبر ۱۹۸۵ تک کے کیسٹ کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کیسٹ نمبر	۱	ایمان
کیسٹ	۲	جدید امکانات
کیسٹ	۳	اسلامی اخلاق
کیسٹ	۴	اتحاد
کیسٹ	۵	تعمیر ملت

عنقریب ان شاء اللہ ان تمام کیسٹوں کی تقریریں کتاب کی صورت میں بھی شائع کر دی جائیں گی۔

۱- ۲۵ اگست ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے "قربانی" سے متعلق آیات کی روشنی میں ایک گھنٹہ کا درس دیا۔ اس اجتماع کی اطلاع اسی دن کے انگریزی اخبارات میں بھی شائع ہو گئی تھی۔ مثلاً ٹائمس آف انڈیا انڈین اکسپریس، اسٹیٹمین، نیشنل ہرلڈ (۲۵ اگست)

۲- مدرسہ باب العلوم (کلکتہ) نے اپنے سالانہ مجلہ کے لیے پیغام کی فرمائش کی تھی۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ان کو ایک پیغام روانہ کیا۔ یہ پیغام زیر نظر اشاعت میں شامل ہے۔

۳- صدر اسلامی مرکز سے ملنے کے لیے روزانہ مرکز میں مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں اور ان سے مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۵ کو ایک ڈاکٹر صاحب ملنے کے لیے آئے جو ایک عرب ملک کے اسپتال میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ باہر کے لیے الرسالہ کا سالانہ چندہ کتنا ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ بیرونی ملک کے لیے سالانہ چندہ کی مقدار تو آپ کو نیچے کے دفتر میں الرسالہ کے منیجر صاحب بتائیں گے۔ البتہ اتنی بات میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ آپ الرسالہ کا سالانہ چندہ جمع کریں اور ایک سال تک اس کے بارہ شمارے پڑھیں آخر میں اگر آپ کو یہ احساس ہو کہ الرسالہ اس قابل نہ تھا کہ میں اتنی رقم اس کے لیے خرچ کرتا تو آپ سال کے بارہ شمارے ہمیں واپس بھیج دیں آپ کو آپ کی پوری رقم بغیر کسی کمی کے لوٹا دی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ سن کر کہا: آپ کا مرکز تو بالکل انوکھا مرکز ہے۔ ایسا تو دنیا کا کوئی بھی پرچہ نہیں کرے گا۔

۴- اللہ کے فضل سے "جدید اسلوب میں اسلامی تعلیمات" اب اسلامی مرکز کی امتیازی صفت بن چکی ہے۔ جو لوگ بھی اس موضوع پر کچھ لکھنا یا بولنا چاہتے ہیں وہ اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ الرسالہ یا ادارہ الرسالہ کی مطبوعات سے مدد لیں۔ وہ مختلف طریقوں سے اس کو استعمال کرتے ہیں اگرچہ قوم میں اعتراف کی نفسیات نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ الرسالہ یا ادارہ الرسالہ کا حوالہ دیے بغیر یہ کام کر رہے ہیں۔ عدم اعتراف کے پردہ میں اس اعتراف کی مثالیں ہر روز کثرت سے سامنے آ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر تعمیر حیات (لکھنؤ) نے اپنی

اشاعت ۱۰ستمبر ۱۹۸۵ میں صدر اسلامی مرکز کا ایک مضمون "عورت کی یادداشت" کے عنوان سے نقل کیا ہے مگر صدر اسلامی مرکز کا نام اس میں شامل نہیں۔

۵۔ اسلامی مرکز کے افکار خدا کے فضل سے عربی اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں اس طرح اسلامی مرکز کا پیغام وسیع تر مسلم دنیا میں پہونچ رہا ہے۔ سعودی عرب کے انتہائی کثیرالاشاعت ہفت روزہ الدعوۃ (۹ستمبر ۱۹۸۵) میں رسالہ کے ایک مضمون کا عربی ترجمہ اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الامتحان الدنیوی سنۃ الٰہیۃ۔ اس سے پہلے اسی الدعوۃ (۶ جون ۱۹۸۳) میں صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو چھپ چکا ہے۔ جس کا عنوان تھا: مع المفکر الاسلامی الکبیر وحید الدین خان

۶۔ اسلامی مرکز کی دو کتابیں، الاسلام اور احیار اسلام، کا ترجمہ عربی زبان میں شائع ہو گیا ہے اول الذکر کتاب کا عربی نام واقعنا ومستقبلنا فی ضوء الاسلام ہے۔ اور ثانی الذکر کتاب کا عربی نام قضیۃ البعث الاسلامی، المنہج والشروط ہے۔ یہ دونوں کتابیں دارالصحوۃ قاہرہ نے شائع کی ہیں۔

۷۔ ایک صاحب سعودی عرب سے لکھتے ہیں: ۳ اگست ۱۹۸۵ شام ساڑھے چار بجے ریڈیو ریاض سے آپ کی کتاب "الاسلام یتحدی" اور تحریک الرسالہ پر تبصرہ نشر کیا گیا تھا۔ جس میں "عبدالرحمٰن صالح العسماوی" نے جناب کے فکر کو بہت سراہا۔ خاص طور پر آپ جدید حالات سے جو سبق لے کر امت مسلمہ کو ایک نئی انرجی عطا کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ آپ نے اپنی مختلف تصانیف میں ذکر کیا ہے۔ یہ بات عبدالرحمٰن صاحب نے بڑے مضبوط انداز میں پیش کی۔ یہ نشریہ روزانہ پیش کیا جاتا ہے کسی بھی بڑے مصنف و مفکر و ادیب کی کتاب میں سے جس کا عنوان ہوتا ہے "قرأۃ من الکتاب" خدائے تعالیٰ کا شکر ہے الرسالہ تحریک عالم اسلام کی اہم تحریکوں میں اور اپنی حیثیت میں منفرد تحریک کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اس عظیم تحریک میں ہمیں وہ استعمال ہونے اور لگنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

۸۔ ایک صاحب دھولیہ سے لکھتے ہیں: الرسالہ کیسٹ نمبر ۲ (جدید امکانات) کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپ نے صحیح راستہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ ان دنوں یہاں مولانا ......

کی ایک تقریر قرآن پر پابندی کے سلسلہ میں بہت دھوم کر رہی ہے۔ اس کے بعد جب "جدید امکانات" کو میں نے سنا تو میں سکتہ میں رہ گیا کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے اور وہ بھی ایک طریقہ تھا۔ وہ طریقہ چندہ پر ختم ہوا اور یہ دینی تبلیغ پر ختم ہوتا ہے (۷، ستمبر ۱۹۸۵)

۹۔ ایک صاحب بمبئی سے لکھتے ہیں: الرسالہ میں ایک منفرد بات یہ ہے کہ اسے کسی بھی شخص کو خواہ وہ کسی بھی شعبہ کا ہو اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو دینے میں ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ یہ بات کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ ہمیں کوئی بھی پرچہ دینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے اور بہت سی جگہ نہ دینے پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ الرسالہ خدا کا خوف، حضور سے شدید محبت اور ایمان مضبوط کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ غصہ، تکبر، گھمنڈ کم ہوتا ہے اور آخرت کا ڈر اور اسلام کو پھیلانے کا احساس بڑھتا ہے۔ ایک پروفیسر صاحب الرسالہ (انگریزی) پر نظر ڈالتے ہوئے خود بخود کہہ اٹھے، بے شک بے شک ۔۔۔ آج کے دور میں کم خرچ، کم وقت اور زیادہ مناسب طریقہ پر ہم غیر مسلموں میں اسلام کو "انگریزی" الرسالہ کے ذریعے ہی پیش کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ مالیگاؤں سے ایک ندوی عالم لکھتے ہیں: الرسالہ جولائی ۱۹۸۵ موصول ہوا۔ "طلاق کا مسئلہ" پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی بے آب وگیاہ صحرا میں آبلہ پا اور خشک دہن پانی کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ اچانک کسی نے آب زلال کا ایک چھلکتا ہوا جام میرے سامنے کر دیا ہو۔ یہ بالکل اپنے دلی تاثر کی سچی اور غیر مبالغہ آمیز، نیز غیر عقیدت آمیز ترجمانی ہے۔ فی الواقع یہ مختصر سا مضمون موجودہ مشکلات ومسائل کے ایک نہایت اہم مسئلے کا مثبت اور مدلل جواب ہے جو یقیناً بے چین اور تڑپتی ہوئی اور بے چارگی وبے بسی کے احساس سے پیچ وتاب کھاتی ہوئی روحوں کے لیے تسکین کا سامان ہے۔ یعنی نفقہ مطلقہ کے متعلق ہماری عدالت عالیہ کے فیصلہ سے مخلصان اسلام اور دردمندان شریعت کو جو قلبی اذیت وجراحت پہونچی ہے۔ اس کی جلن اور سوزش کا مرہم ہے۔

۱۱۔ جناب ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ "پیغمبر انقلاب" کا ترجمہ انڈونیشی زبان میں شائع ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اوصاف علی صاحب کے خط کا عکس یہاں دیا جا رہا ہے۔



NDIAN INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES

Phones : 653877
344230

TUGHLAQABAD
NEW DELHI-110062

27/ ستمبر 1985

مکرمی و محترمی ! السلام علیکم

اگست میں میں انڈونیشیا گیا ہوا تھا - وہاں ایک کتب خانہ میں مجھے
آپ کی کتاب نظر آئی جسکا عنوان یہ ہے - (Revolusi
Pemikiran Islam) معلوم نہیں مترجم نے آپ سے ترجمہ کرنے
کی اجازت لی یا نہیں اور آپ کو ترجمہ کا کوئی نسخہ بھیجا یا نہیں -
آج کل انڈونیشیا میں بے شمار کتابوں کے ترجمے شائع ہورہے ہیں-آپ
کی کتاب کے ناشر کا پتہ ذیل میں درج ہے - میں وہاں تک نہیں پہونچ
سکا ورنہ آپ کے لئے ایک نسخہ خرید لا تا -

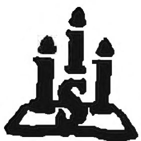
Media Da'wah
Jl. Karamat Raya 45
Jakarta Pustat

امید ہے آپ امریکہ میں ہونے والی عالمی مذہبی کانفرنس میں
شرکت کی تیاری کر رہے ہوں گے -

والسلام

اوصاف علی

اوصاف علی



NDIAN INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES

Phones : 653877
344230

TUGHLAQABAD
NEW DELHI-110062

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

November 1985
Issue No. 108

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128